فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۂ القدر ۔ ۹۷

۱-- تا -- ۵

سورۂ القدر ایک نظر میں

اس سورت میں ایک مخصوص رات کا ذکر ہے' جس میں بہت سرگرمیاں تھیں اور سب لوگ وہاں حاضر تھے۔ پوری کائنات نے ریکارڈ کیا کہ یہ تو کوئی غیر معمولی بات ہے' جو لوگ اس محفل میں تھے وہ بہت ہی خوش نصیب' خوش و خرم اور رب ذوالجلال کے سامنے ہمہ تن گوش اور نہایت ہی عاجزی سے دست بدعا تھے' یہ کس قدر اہم رات تھی؟ یہ ایسی رات تھی جس میں اس زمین یا اہل زمین کا رابطہ عالم بالا سے ہوا۔ یہ وہ رات تھی جب عالم بالا کا پیغام' قرآن' قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اترنا شروع ہوا۔ اس رات میں ایک ایسا واقعہ ہوا جو اپنی عظمت' اپنے اثرات اور اپنی معنونیت کے اعتبار سے ایک ایسا واقعہ تھا' جس کی نوعیت کا کوئی واقعہ اس زمین نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ اس قدر عظیم تھا کہ انسان کی محدود قوت مدرکہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ واقعہ یہ تھا:

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (۱) وَمَا اَدْرٰىكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ (۲) لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ (۳) (۹۷: ۱ تا ۳) ''ہم نے اس کو لیلۃ القدر میں نازل کیا ہے اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ایک ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے''۔

وہ آیات قرآنیہ' جن میں اس واقعہ کا ذکر ہے وہ اس طرح چمک رہی ہیں' اور اس طرح نور بکھیر رہی ہیں کہ اپنے پورے ماحول کو منور کر رہی ہیں' ان آیات سے ایک مسلسل' نہایت ہی خوبصورت' اور نہایت ہی پسندیدہ اور دھیمی روشنی بکھیر رہی ہے' یہ اللہ کا نور ہے جو پوری کائنات کو بقعہ نور بنا رہا ہے اور یہ نور قرآن سے پھوٹ رہا ہے۔

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷: ۱) ''ہم نے اسے قدر والی رات میں اتارا ہے''۔ یہ فرشتوں اور فرشتوں کی روح حضرت جبرئیل علیہ السلام کا لایا ہوا نور ہے جو صبح و شام زمین و آسمان کے درمیان چکر لگاتے رہتے ہے:

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ (۹۷: ٤) ''فرشتے اور روح' اس میں اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں''۔ اور صبح صادق کی روشنی اور قرآن کی روشنی کو قرآن کریم میں یکجا کر کے لایا جاتا ہے۔ جس کے ساتھ فرشتوں اور اسلام کی سلامتی کی روشنی اور روح شامل ہوتی ہے اور یہ سب روشنیاں اس جہاں میں زندہ ارواح کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہیں۔ اور ان کے اوپر چمکتی ہیں اور پھر اس پوری کائنات کی حالت یہ ہو جاتی ہے۔

سَلٰمٌ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷: ۵) ''یہ رات سراسر سلامتی ہے طلوع فجر تک''۔

یہ رات جس کا یہاں تذکرہ ہوا ہے' وہی رات ہے جس کا ذکر سورہ دخان کی اسی آیت میں ہوا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِیْنَ (۳) فِیْهَا یُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٍ (٤) اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِیْنَ (٥) رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (٦)

(٤٤: ۳ تا ٦) "بے شک ہم نے اس کو بابرکت رات میں اتارا ہے۔ یقیناً ہم لوگوں کو خبردار کرنے والے ہیں' اس رات میں تمام حکیمانہ امور ہمارے حکم سے طے ہوتے ہیں اور بے شک ہم رسول بھیجنے والے ہیں۔ یہ تمہارے رب کی رحمت کے باعث ہے۔ یقیناً وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ اور یہ رات رمضان شریف ہی کی راتوں میں سے ایک رات ہے۔ سورہ بقرہ میں اس کی تصریح ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ (۲: ۱۸٥) "رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا' جو انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور جس میں ہدایت کے واضح دلائل اور حق و باطل میں فرق کرنے والی واضح تعلیمات ہیں"۔ مطلب یہ ہے کہ رمضان شریف میں نزول قرآن کا آغاز ہوا۔ یہ رمضان شریف کے مہینے میں تھا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں عبادت گزاری میں مصروف تھے۔

اس رات کے تعین میں کئی احادیث اور روایات مروی ہیں۔ بعض میں تصریح کی گئی ہے کہ یہ رمضان المبارک کی ستائیسویں رات ہے۔ بعض میں ہے کہ یہ اکیسویں رات ہے اور بعض میں ہے کہ یہ آخری عشرہ کی کوئی رات ہے۔ بعض روایات میں یہ آتا ہے کہ یہ رمضان شریف کی راتوں میں سے کوئی ایک رات ہے۔ بہرحال راجح بات اور یقین بات یہی ہے کہ یہ رمضان شریف کی ایک رات ہے۔

---o o o---

درس نمبر ۲۹۷ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۵

آیَاتُهَا ۵　سُوْرَةُ الْقَدْرِ (۹۷)　مَكِّيَّةٌ (۲۵)　رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ﴿۱﴾ وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ ﴿۲﴾ لَیْلَةُ

الْقَدْرِ ۙ۬ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ﴿۳﴾ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ الرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ　۱

رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ﴿۴﴾ سَلٰمٌ ۛ هِیَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ﴿۵﴾　الثلثة　ع ۵

۲۲

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔ اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں وہ رات سراسر سلامتی ہے طلوع فجر تک"۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷ : ۱) "ہم نے اسے لیلتہ القدر میں اتارا ہے"۔ لیلتہ القدر کے معنی تقدیر اور تدبیر بھی ہو سکتے ہیں، اور قابل قدر اور بلند مرتبہ کے بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں معانی اس عظیم الشان کائناتی واقعہ کے ساتھ مناسب ہیں، یہ واقعہ کہ اس رات میں قرآن کریم نازل ہوا، یہ آخری رسالت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہوئی اور آپ ؐ نے دعوت کا کام شروع کیا۔ میں سمجھتا ہوں اس کائنات میں اس سے بڑا کوئی واقعہ نہیں ہے۔ اور انسانوں کی زندگی میں اس سے پر معنی اور زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت والا کوئی واقعہ بھی نہیں ہے۔ یہ رات ایک ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ مراد ہزار مہینوں کی تحدید نہیں ہے، مراد ہے کہ ہزارہا راتوں سے یہ رات زیادہ قیمتی ہے۔ الف شہر سے مراد زیادہ راتیں ہیں۔ مطلب ہے ہزاروں لاکھوں راتوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ یوں کہ ہزاروں لاکھوں کروڑوں راتیں انسانی زندگی کو اس قدر متاثر نہیں کر سکیں۔ جس قدر اس رات نے انسانی زندگی کو متاثر کیا۔ اس رات نے انسانی زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ (۹۷ : ۳) "شب قدر ایک ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے"۔

وَمَا أَدْرٰكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ (۹۷ : ۲) "اور تم کیا جانو کہ لیلتہ القدر کیا ہے"۔ یہ اس قدر عظیم ہے کہ انسانی فہم و ادراک کی حدود سے ماوراء ہے۔ بس یہی ہے اس کا مفہوم اور اس سلسلے میں عامتہ الناس میں جو اوہام و خرافات مشہور ہیں۔ ان کے تذکرے کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس یہ ایک نہایت ہی عظیم رات ہے' اور اس کی عظمت اس وجہ سے ہے کہ اس کو اللہ نے ایک عظیم کام کے لیے منتخب کیا ہے یعنی نزول قرآن کریم کے لیے اور اس لیے کہ اللہ نے اس رات کو اپنے نور سے پوری کائنات کو بھر دیا۔ اور اس رات کو اللہ نے انسانیت کو وہ چیز عطا کی تھی جس کی اسے بے حد ضرورت تھی۔ انسانی روح اور انسانی زندگی کو اس رات یہ عطیہ ملا یعنی عمومی امن و سلامتی اور امن و سلامتی کا پیغام یعنی قرآن دیا۔ جس میں صحیح عقائد و تصورات وضاحت سے بیان ہوئے۔ جس میں ایسے آداب زندگی ثبت ہوئے جن کی وجہ سے انسانی ضمیر اور انسانی ماحول یعنی پوری زمین کو سلامتی ملی۔ اور حضرت روح الامین اس رات کو پیغام لے کر فرشتوں کے جلو میں آئے۔ یہ ایک جشن کا سماں تھا' انسانیت کو تو بہار مل رہی تھی۔ اسی جشن کو قرآن نے نہایت ہی عجیب انداز میں یہاں بیان کیا ہے۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ أَمْرٍ (۹۷ : ٤) "فرشتے اور روح الامین اس میں اپنے رب کے حکیم سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں"۔ آج جب ہم صدیوں پیچھے کی طرف نظر دوڑاتے ہیں اور پھر ہماری نگاہ اس بزرگ اور عظیم رات پر پڑتی ہے۔ اور ہم اس جشن پر غور کرتے ہیں جو اس رات دیکھا گیا۔ پھر ہم ان امور کو دیکھتے ہیں جو اس رات میں فیصلہ ہوئے اور مکمل ہوئے اور دیکھتے ہیں کہ انسانی تاریخ نے کیا سفر طے کیا' کیا واقعات و حادثات رونما ہوئے' اس رات کے فیصلوں کے نتیجے میں انسانی قلب و نظر میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ ایک عظیم رات تھی اور اس میں بتایا جانے والا یہ حسن نو بہاراں بھی فی الواقعہ بجا تھا اور آج ہمیں اللہ کا یہ کلام اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے۔

وَمَا أَدْرٰكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ (۹۷ : ۲) "تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے"۔ اور یہ کہ اس رات تمام حکیمانہ امور طے ہوئے' اس رات اساس دین' دینی اقدار اور حسن و قبح کے پیمانے طے ہوئے۔ اس رات افراد کے علاوہ حکومتوں' ملتوں اور اقوام کی قسمتوں کا فیصلہ ہوا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر جس اہم چیز کا فیصلہ ہوا وہ یہ ہے کہ حق کا معیار طے ہوا۔ مستقل قدریں طے ہوئیں۔ طریق زندگی اور نظام شریعت طے ہوا اور روحانی اقدار طے ہوئیں۔ سَلٰمٌ "وہ رات سراسر سلامتی ہے"۔ انسانیت نے اپنی جہالت اور بدبختی کی وجہ سے شب قدر کی قدر و قیمت کو بھلا دیا ہے۔ اور اس عظیم واقعہ کی اہمیت کو دل سے محو کر دیا ہے' حالانکہ انسانی تاریخ کا یہ ایک عظیم واقعہ تھا' اور جب سے انسانیت نے اس عظیم واقعہ کو بھلایا اور اس عظیم پیغام کے حوالے سے غفلت کا مظاہرہ کیا تو انسانیت اللہ کی عظیم ترین رحمت و سعادت سے محروم ہو گئی۔ وہ کیا تھی؟ حقیقی امن و سلامتی کی سعادت' انسانی ضمیر و نفسیات میں امن و سلامتی کی سعادت' انسانی خاندان میں امن و سلامتی کی سعادت' وہ ہمہ گیر سعادت تھی جس سے اسلام نے دنیا کو مالا مال کر دیا تھا۔ یہ درست ہے کہ انسان نے اس عرصہ میں بے پناہ مادی ترقی کی' دنیا کو خوب آباد و شاداب کیا۔ لیکن اسلام نے جو امن

و سلامتی عطا کی ہے اسے انسان نہ پا سکا۔ باوجود مادی ترقی اور بے پناہ پیداوار کے انسانیت بدبخت ہی رہی۔ وہ خوبصورت نور بجھ گیا جس نے کبھی اس کی روح کو روشن کر دیا تھا۔ اور وہ روشن خوشی ختم ہو کر رہ گئی جس نے اسے زمین کے بندھنوں سے آزاد کر کے عالم بالا کے ساتھ معلق کر دیا تھا' اور وہ مجموعی سلامتی ختم ہو گئی۔ جس کے فیوض و برکات انسانی قلب اور ارواح سے سرشار ہو گئے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ کھو چکنے کے بعد انسان نے نہ روحانی خوشی پائی' نہ آسمانی روحانیت ملی اور نہ انسان کو یہ آزادی ملی کہ وہ زمینی بوجھ سے ذرا اٹھ کر آسمانوں تک پہنچے۔

هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷ : ۵) "یہ طلوع فجر تک ہے"۔ ہم اہل ایمان اس بات پر مامور ہیں کہ اس جشن نو بہار اں کو بھی نہ بھلائیں۔ یہ اچھی یادیں ہیں' اور ان یادوں کو تازہ رکھنے کے لیے ہمارے نبیؐ نے ہمارے لیے بہت ہی سہل طریقے بتائے ہیں تاکہ ہماری روحیں اس سرچشمے سے مربوط ہیں۔ اور وہ عظیم کائناتی واقعہ انہیں یاد رہے جو اس رات میں وقوع پذیر ہوا۔ وہ یوں کہ حضورؐ نے ہمیں تاکید فرمائی کہ ہر سال اس رات کو اللہ کی عبادت میں کھڑے رہو اور رمضان شریف کی آخری دس راتوں میں اسے تلاش فرد' صحیح حدیث ہے۔ تحروا لیلة القدر في العشر الاواخر من رمضان "شب قدر کو رمضان کی آخری راتوں میں تلاش کرو"۔ اور صحیحین ہی کی ایک دوسری روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ من قام لیلة القدر ایمانا و احتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه "جس شخص نے شب قدر میں اللہ کی عبادت ایمان اور حسبۃ للہ کی حالت میں کی اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے"۔

اسلام محض ظاہری رسومات اور اشکال کا نام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عبادت کے سلسلے میں فرمایا۔

ایمانا و احتسابا "یعنی ایمان اور اخلاص کے ساتھ" تاکہ یہ قیام و عبادت اعلیٰ مقاصد کے لیے ہو جو اس رات میں متعین ہوئے اور احتساب کے طور پر یعنی خالص اللہ کے لیے ان دو شرائط سے انسانی دل میں ایسے حقائق جاگزیں ہوتے ہیں۔ جو انسان کو ان معانی کے ساتھ مربوط کر دیتے ہیں جن کے لیے قرآن نازل ہوا۔

اسلامی نظام زندگی کا یہ طریقہ ہے کہ وہ ایمان و عمل' ضمیر کے اندر موجود معتقدات اور عملی عبادات کے درمیان ربط پیدا کرتا ہے اور نظام عبادات اس طرح تجویز کرتا ہے جس کے ذریعہ انسان کے ضمیر و شعور میں وہ عقائد اچھی طرح مستحکم ہو جائیں اور زندہ مشکل میں موجود ہوں اور یہ نظریہ و عقائد محض افکار کی حد تک محدود نہ ہوں بلکہ ان کا عملی اور زندہ اظہار بھی ہو۔

یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اسلامی نظام زندگی اور نظام عبادت دراصل ایک بہترین نظام ہے جو ان حقائق کو زندہ کرتا ہے اور انسانی ضمیر و شعور میں بھی اور عمل اور طرز عمل میں بھی زندہ اور متحرک کرتا ہے' ان حقائق کا محض ذہنی ادراک' بغیر عمل و عبادت کے' ان عقائد و نظریات کو ثبات و قرار نہیں بخش سکتا۔ عبادات و عمل کے بغیر نہ فرد کی زندگی اور نہ سوسائٹی میں یہ حقائق زندہ اور متحرک ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لیلۃ القدر کی یہ یاد اور اس میں ایمان اور خلوص کے ساتھ عبادت کرنے کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ اسلامی نظام زندگی کے منہاج اور طریقہ کار کا ایک خاص پہلو ہے۔

---○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ البینۃ ـ ۹۸

۱-- تا-- ۸

سورۃ البینۃ ایک نظر میں

قرآن کریم کے اکثر نسخوں اور اکثر روایات میں اسے مدنی سورتوں میں شمار کیا گیا ہے' جبکہ بعض روایات ایسی بھی وارد ہیں کہ یہ مکی ہے۔ روایات کے اعتبار سے اور اسلوب بیان کے اعتبار اس کے مدنی ہونے کو زیادہ ترجیح ملتی ہے۔ جبکہ اس کا مکی ہونا ممکن نہیں ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ اس میں زکوٰۃ کا ذکر ہے یا اہل کتاب کا ذکر ہے۔ یہ اس کے مکی ہونے کے مانع نہیں ہے' کیونکہ بعض دوسری سورتیں جو یقیناً مکی ہیں ان میں بھی اہل کتاب کا ذکر ہے۔ مکہ میں اہل کتاب موجود تھے' جن میں سے بعض ایمان بھی لائے تھے اور بعض ایمان نہ لائے تھے۔ نیز نجران کے عیسائی بھی ایک وفد کی صورت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں آکر ملے تھے اور ایمان بھی لائے تھے اسی طرح زکوٰۃ کا تذکرہ بھی مکی سورتوں میں پایا جاتا ہے۔

یہ سورت کئی تاریخی اور ایمانی حقائق ہمارے سامنے رکھتی ہے۔ لیکن اس کا اسلوب ایک قرارداد کے اسلوب میں ہے' اور یہ اسلوب ہی اس رائے کو ترجیح دیتا ہے کہ یہ مدنی ہے جہاں بات فیصلہ کن اور معاملات و امور طے کرنے کے انداز میں ہوتی تھی۔

اس سورت میں پہلی حقیقت یہ بیان کی جاتی ہے کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس لیے ضروری ہوگئی تھی کہ ان کو واپس لاکر صراط مستقیم پر قائم کیا جائے اور ان کے اندر جو تفرقے اور اختلافات پیدا ہوگئے تھے وہ اس رسالت کے بغیر درست نہ ہو سکتے تھے :

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ (۱) رَسُولٌ مِنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُطَهَّرَةً (۲) فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۳) (۹۸: ۱ تا ۳) ''اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے' (وہ اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس دلیل روشن نہ آجائے (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہیں''۔

دوسری حقیقت یہ بیان ہوتی ہے کہ اہل کتاب نے اپنے دین میں اختلاف اس وجہ سے نہیں کیا کہ ان کے دین میں کچھ مشکلات تھیں' بلکہ صحیح علم ان کے پاس آگیا تھا اور ہر مسئلے پر صحیح دلائل بھی ان کے ہاں موجود تھے۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ (۹۸: ۴) ''پہلے جن

لوگوں کو کتاب دی گئی تھی' ان میں تفرقہ برپا نہیں ہوا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح بیان آ چکا تھا"۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ تمام ادیان اپنے اصل کے اعتبار سے ایک ہیں' ان کے بنیادی قواعد اور اصول ایک ہیں اور سادہ اور قابل فہم ہیں' ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہوا کرتی جس سے اختلاف پیدا ہوں کیونکہ دین کی بنیادیں سادہ اور قابل فہم ہوتی ہیں۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (۹۸ : ۵) "اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں' اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے' بالکل یک سو ہو کر' اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہی نہایت صحیح و درست دین ہے"۔

اور چوتھی حقیقت یہ ہے کہ دلائل آ جانے کے بعد جو لوگ کفر کریں گے وہ تمام لوگوں میں سے بدترین ہیں اور جو لوگ اس آخری رسالت کو تسلیم کریں گے وہ بہترین لوگ ہیں۔ اس لیے دونوں قسم کے لوگوں کا انجام بھی مختلف ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ (۶) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (۷) جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِىَ رَبَّهٗ (۸) (۹۸ : ۶ تا ۸) "اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ یقیناً جہنم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے' یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔ جو لوگ ایمان لے آئے اور جنہوں نے نیک عمل کیے' وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں۔ ان کی جزا ان کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ کچھ ہے اس شخص کے لیے جس نے اپنے رب کا خوف کیا ہو"۔

یہ ہیں وہ چار بنیادی حقائق جو اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام عقائد اور آخری رسالت میں اور اسلامی نظام ایمانیات و عمل میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

---○○○---

درس نمبر ۲۹۸ تشریح آیات

۱-- تا-- ۸

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۙ﴿۱﴾ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ﴿۲﴾ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ؕ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے' (وہ اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس دلیل روشن نہ آجائے (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ زمین کو ایک جدید رسالت کی ضرورت تھی۔ اس زمین میں ہر طرف شر و فساد عام ہو گیا تھا اور مذاہب عالم کا حال تھا کہ ان کی اصلاح ممکن ہی نہ رہی تھی۔ ایک جدید دین اور جدید رسالت کی ضرورت تھی۔ ایک نئی تحریک اور نئے نظام کی ضرورت تھی۔ اہل زمین کے عقائد و نظریات میں کفر سرایت کر چکا تھا' چاہے وہ اہل کتاب ہوں جن کو صحیح سماوی دین دیئے گئے تھے مگر انہوں نے جاننے کے بعد انہیں بھلا دیا تھا اور دین میں مکمل تحریف کر دی تھی' چاہے وہ جزیرۃ العرب کے مشرک ہوں اور اس سے باہر کے مشرک ہوں۔ دونوں کفر کی حالت میں داخل ہو گئے تھے۔

یہ کفر اور تحریف کے جس مقام پر پہنچ چکے تھے' وہاں سے ان کی واپسی ممکن نہ تھی' ان کی اصلاح صرف ایک جدید دین ہی کے ذریعہ ہو سکتی تھی' صرف ایک ایسے رسولؐ کے ذریعہ جو بذات خود ایک بین دلیل ہو' اور اس کے پاس اپنی کتاب ہو جو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہو۔

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً (۹۸ : ۲) "یعنی اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے

پڑھ کر سنائے"۔ یہ صحیفے شرک اور کفر سے پاک ہوں۔

فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۹۸ : ۳) "جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔ "کتاب" کا لفظ موضوع اور مضمون پر بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً کتاب الطہارہ، کتاب الصلوۃ اور کتاب القدر۔ کتاب القیامہ، صحف مطہرہ سے مراد یہ قرآن ہے۔ جس میں راست اور درست کتابیں ہیں یعنی موضوعات و مسائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ رسالت اور یہ رسول نہایت وقت پر آئے۔ اور یہ صحیفے، یہ سورتیں اور یہ موضوعات سخن اور مسائل آئے تاکہ زمین کے اندر ایسی انقلابی اصلاح کریں جس کے سوا اصلاح کی کوئی اور صورت ممکن ہی نہ تھی۔ اس دور میں دنیا کو اس رسولؐ اور اس پیغام اور اس کتاب کی ضرورت کیونکر تھی؟ اس کا جواب میں ایک عظیم اسلامی مفکر سید ابو الحسن علی ندوی کی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کے ایک اقتباس سے دوں گا۔ یہ اقتباس نہایت مختصر اور موضوع پر واضح ہے۔ وہ باب اول کے فصل اول میں لکھتے ہیں :

چھٹی صدی عیسوی بلا اختلاف تاریخ انسانی کا تاریک ترین اور پست ترین دور تھا، صدیوں سے انسانیت جس پستی اور نشیب کی طرف جا رہی تھی۔ وہ اپنے آخری نقطے تک پہنچ چکی تھی اور روئے زمین پر اس وقت کوئی طاقت نہ تھی جو گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑ سکے اور ہلاکت کے غار میں گرنے سے اسے روک سکے۔ انسانیت کی حالت یہ تھی کہ نشیب کی طرف جاتے ہوئے روز بروز اس کی رفتار تیز ہو رہی تھی۔ انسان اس صدی میں خدا فراموش ہو کر، کامل طور پر خود فراموش بن چکا تھا۔ وہ اپنے انجام سے بالکل بے فکر اور بے خبر اور برے بھلے کی تمیز سے قطعاً محروم ہو چکا تھا۔ پیغمبروں کی دعوت کی آواز، عرصہ ہوا، دب چکی تھی۔ جن چراغوں کو یہ حضرات روشن کر گئے تھے وہ ہواؤں کے طوفان میں یا تو بجھ چکے تھے۔ یا گھٹاٹوپ اندھیرے میں اس طرح ٹمٹما رہے تھے جن سے چند خدا شناس دل ہی روشن تھے۔ جو شہروں کو تو کیا روشن کرتے، چند گھروں کو بھی پوری طرح روشن نہ کر سکتے تھے۔ دین دار اشخاص دین کی امانت کو اپنے سینے سے لگا کر، زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہو کر دیر و کلیسا اور صحراؤں اور غاروں میں تنہائیاں اختیار کر چکے تھے اور زندگی کی کشمکش، اس کے مطالبات، اور اس کی خشک اور تلخ حقیقتوں سے دامن بچا کر دین و سیاست اور روحانیت اور مادیت کے معرکہ میں شکست کھا کر، اپنے فرائض قیادت سے دستکش ہو گئے تھے اور جو زندگی کے اس طوفان میں رہ گئے تھے، انہوں نے بادشاہوں اور اہل دنیا سے ساز باز کر لی تھی، اور ان کی ناجائز خواہشات اور ظالمانہ نظام سلطنت اور ظالمانہ نظام معیشت ان کے معاون ہو گئے تھے اور لوگوں کے مال کھانے اور ان کی قوت اور دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں ان دنیا داروں کے شریک و سہیم ہو گئے تھے"۔

"اس دور میں بڑے بڑے مذاہب بازیچہ اطفال بن گئے تھے اور منافقین کے لیے یہ مذاہب تختہ مشق بنے ہوئے تھے۔ ان مذاہب کی ظاہری صورت اور معنوی حقیقتوں کو اس حد تک مسخ کر دیا گیا تھا کہ اگر ان کے بانیاں اور داعیان کے لیے اس صدی میں آنا ممکن ہوتا اور وہ دیکھ سکتے کہ ان کے مذاہب کا کیا حشر ہوا ہے تو وہ ہرگز ان مذاہب کو پہچان ہی نہ سکتے۔ تہذیب و تمدن کے گہواروں میں خود سری، بے راہ روی اور اخلاقی گراوٹ پیدا ہو گئی تھی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ تمام اقوام اپنے اندرونی اختلافات و مسائل میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے نہ ان کے

پاس کوئی پیغام تھا اور نہ انسانیت کے لیے کوئی دعوت تھی' درحقیقت یہ اقوام اور مذاہب اندر سے پوری طرح کھوکھلے اور بودے ہو چکے تھے۔ ان کی زندگی کے سوتے خشک ہو چکے تھے۔ ان کے پاس نہ دینی ہدایات اور تعلیمات تھیں اور نہ نظام حکومت کے لیے کوئی معقول اصول تھے"۔ (کتاب مذکور' ص ۳۷' ۳۸ و ص ۳۹' ۴۰)

یہ تیز رفتار جھلک' بعثت محمدیؐ سے قبل دنیا کے ادیان کی حالت کی نہایت ہی اچھی اور مختصر تصویر دکھاتی ہے۔ اہل کتاب اور مشرکین جن نکات کی وجہ سے کفر کی سرحدوں میں داخل ہو گئے تھے۔ قرآن کریم نے ان کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے' مثلاً یہودیوں اور نصاریٰ کے بارے میں قرآن نے یہ تصریح کی ہے۔

وَ قَالَتِ الْیَھُوْدُ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰہِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰہِ (۹: ۳۰)

"یہود نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے عیسائیوں نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے"۔ اور دوسرے مقام پر ہے۔

وَ قَالَتِ الْیَھُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیْءٍ وَ قَالَتِ النَّصٰرٰی لَیْسَتِ الْیَھُوْدُ عَلٰی شَیْءٍ (۲: ۱۱۲) "یہود نے کہا کہ نصاریٰ کی کوئی دینی حیثیت نہیں ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ یہودیوں کی کوئی دینی بنیاد نہیں ہے"۔

اور یہودیوں کے بارے میں سورۂ مائدہ آیت ۶۴ میں یہ ہے۔

وَ قَالَتِ الْیَھُوْدُ یَدُ اللّٰہِ مَغْلُوْلَۃٌ غُلَّتْ اَیْدِیْھِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا بَلْ یَدٰہُ مَبْسُوْطَتٰنِ یُنْفِقُ کَیْفَ یَشَآءُ (۵: ۶۴) "یہود کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں' ان کے ہاتھ بندھ جائیں اور ان کی اس بات کا سبب ان پر لعنت ہو' بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ وہ خرچ کرتا ہے جس طرح چاہتا ہے"۔

اور مائدہ ۷۲ میں ہے۔

لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ (۵: ۷۲) "یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہے" اور

لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ (مائدہ: ۷۳) "یقیناً کافر ہوئے وہ لوگ جنہوں نے کہا اللہ تین کا تیسرا ہے"۔

اور مشرکین کے بارے سورہ الکافروں میں ہے:

قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ (۱) لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (۲) وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (۳) وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ (۴) وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (۵) لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ (۶) (۱۰۹: ۱ تا ۶) "کہہ دو اے کافرو' میں ان کی عبادت نہیں کرتا' جن کی عبادت تم کرتے ہو' اور نہ تم

عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں' اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو' اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے"۔ یہ اور دوسری آیات جن میں مشرکین اور دوسرے کفار کی طرف اشارہ ہے۔

اور اس کفر کے نتیجے میں دنیا کے اطراف و اکناف میں شر و فساد اور تخریب و زوال عام تھا۔ مولانا ندوی کے الفاظ میں: "خلاصہ یہ کہ ساتویں صدی عیسوی میں روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہ آئی تی جو مزاج کے اعتبار سے صالح کہی جا سکے اور نہ ایسی کوئی سوسائٹی تھی جو شرافت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کی حامل ہو' نہ ایسی کوئی حکومت تھی جس کی بنیاد عدل اور انصاف اور رحم پر ہو' اور نہ کوئی ایسی قیادت تھی جس کے پاس کوئی علم و حکمت ہو' نہ دنیا میں کوئی ایسا دین تھا جسے صحیح دین انبیاء کہا جا سکتا ہو' اور ان کی تعلیمات اور خصوصیات کا حامل ہو"۔

یہ وہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے اللہ کی رحمت کا تقاضا ہوا کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لیے ایک اَیسا رسول بھیجے' جو پاکیزہ صحیفے پڑھے' جن کے اندر نہایت ہی راست اور درست تعلیمات ہوں۔ حقیقت یہ کہ مشرکین اور اہل کتاب کے کفار' ایک ایسی نئی رسالت اور ایسے دین کے سوا کسی صورت میں بھی اس شر و فساد اور اس زوال و گراوٹ سے نکل نہ سکتے تھے۔

یہاں قرآن مجید اس بات کی وضاحت کر دیتا ہے کہ اہل کتاب نے جو انحراف کی راہ لی یا باہم اختلافات کیے تو یہ جہالت کی وجہ سے نہ تھے۔ یا اس وجہ سے نہ تھے کہ دین سماوی کی تعلیمات میں کچھ پیچیدگی یا اجمال تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ صحیح علم ان کے پاس آ چکا تھا' حق کے دلائل ان کے پاس موجود تھے اور اس کے باوجود انہوں نے باہم اختلاف کیا:

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝۴

"پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی ان میں تفرقہ برپا نہیں ہوا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس (راہ راست) کا بیان واضح آ چکا تھا"۔

پہلا اختلاف تو یہودیوں کے درمیان ہوا' یہ اختلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے قبل ہوا۔ یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور کئی فرقے اور پارٹیاں بن گئے۔ حالانکہ ان کا رسولؑ ایک تھا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی کتاب بھی ایک تھی یعنی تورات۔ یہ پانچ فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ مثلاً صدوقی' فریسی' آسین' غالی اور سامری۔ ان فرقوں میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے عقائد' خصائص اور اپنا اپنا رخ تھا اور جب عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو یہودی اور عیسائی تنازعہ شروع ہو گیا۔ حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل میں سے آخری نبی تھے اور آپؑ نے تورات کی تصدیق فرمائی۔ یہودی اور مسیحی اختلافات اس قدر بڑھے کہ یہ دشمنی اور عداوت کی شکل اختیار کر گئے۔ اور دونوں فریقوں کے درمیان شدید نفرت پیدا ہو گئی اور اس کے نتیجے میں جو قتل عام ہوتا رہا ہے وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ یہ ایسا قتل عام تھا کہ جب انسان ان واقعات کو آج بھی پڑھتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

"چھٹی صدی کے آخر میں یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی رقابت اور منافرت اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ ان میں سے

کوئی دوسرے فریق کو ذلیل کرنے اور اس سے اپنی قوم کا انتقام لینے اور مفتوح کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرنے میں 'کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ ۶۱۰ء میں یہودیوں نے انطاکیہ میں عیسائیوں کے خلاف بلوہ کیا' شہنشاہ موتاس نے ان کی سرکوبی کے لیے مشہور فوجی افربنو سوس کو بھیجا۔ اس نے پوری پوری آبادی کا اس طرح خاتمہ کیا کہ ہزاروں کو تلوار سے' سینکڑوں کو دریا میں غرق کر کے آگ میں جلا کر اور درندوں کے سامنے ڈال کر ہلاک کر دیا"۔ (دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر' ص ۴۷)

"مقریزی کی کتاب الخطط میں ہے' فوقاس روم کے شہنشاہ کے زمانے میں ایران کے شہنشان کسریٰ نے شام اور مصر پر فوج کشی کی۔ اس فوج نے بیت المقدس' فلسطین اور شام کے گرجاؤں کو مسمار کیا اور شام کے تمام عیسائیوں کو قتل کر دیا۔ پھر وہ عیسائیوں کی تلاش میں مصر آیا' جہاں اس کی فوج نے عیسائیوں کو بہت بڑی تعداد میں قتل کیا اور بے حد و حساب افراد کو قید کر لیا۔ عیسائیوں کے خلاف اس جنگ میں اور گرجاؤں کو مسمار کرنے میں یہودیوں نے ایرانیوں کی مدد کی اور وہ طربیہ' جبل الجلیل' قریہ' ناصرہ' صور اور بلاد قدس سے ایرانیوں کے پاس آئے اور انہوں نے عیسائیوں سے خوب انتقام لیا اور انہیں اذیت رسانی' اور قتل و غارت گری کا نشانہ بنایا۔ قدس میں ان کے دو گرجاؤں کو مسمار کر دیا اور تمام مکانات کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ مقدس عود صلیب کا ٹکڑا ساتھ لے گئے اور قدس کے پوپ اور ان کے بہت سے ساتھیوں کو قید کر لیا"۔

یہی مصنف قدس مفتوح ہونے کا ذکر یوں کرتا ہے: "اس اثنا میں یہودیوں نے صور کے شہر میں بغاوت کر دی۔ انہوں نے اپنے نمایندوں کو دوسرے شہروں میں بھیجا۔ چنانچہ یہودیوں نے عیسائیوں پر شدید حملہ کرنے اور انہیں قتل کر ڈالنے کے عہد و پیمان کیے۔ اس کے بعد دونوں فریقوں میں جنگ چھڑ گئی۔ یہودی بیس ہزار کی تعداد میں مجتمع ہو کر حملہ آور ہوئے اور انہوں نے صور کے باہر کے گرجاؤں کو مسمار کر دیا۔ اس پر عیسائیوں نے کثیر تعداد میں جمع ہو کر یہودیوں پر حملہ کیا۔ یہودیوں کو شکست فاش ہوئی اور ان کی بہت بڑی تعداد مقتول ہوئی۔ اس زمانے میں ہرقل قسطنطنیہ میں روم کا فرماں روا ہوا۔ اس نے ایک تدبیر سے جو اس نے شاہ ایران کے خلاف کی ایرانیوں کو شکست دے دی اور وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ اس فتح کے بعد ہرقل قسطنطنیہ سے روانہ ہوا تاکہ شام اور مصر کا نظم حکومت درست کرے۔ اور ایرانیوں نے جن مقامات کو تباہ و برباد کیا ہے' ان کی تعمیر نو کرے۔ یہودی طربیہ سے آکر ہرقل کے پاس حاضر ہوئے' اسے گراں قدر تحفے دیئے اور اس سے حلفیہ امان طلب کی۔ ہرقل نے انہیں حلفیہ امان دے دی۔ اس کے بعد ہرقل بیت المقدس پہنچا۔ عیسائیوں نے انجیلوں' صلیبوں' بخور اور جلتی ہوئی مشعلوں سے اس کا استقبال کیا۔ ہرقل نے شہر اور اس کے گرجاؤں کو برباد پایا' جس سے اسے شدید صدمہ ہوا۔

عیسائیوں نے ہرقل کو بتایا کہ کس طرح یہودی ایرانیوں کے ساتھ مل کر عیسائیوں کے خلاف حملہ آور ہوئے۔ انہیں قتل کیا اور ان کے گرجاؤں کو مسمار کیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ قتل و غارت گری میں وہ ایرانیوں سے بھی بدتر تھے اور انہوں نے عیسائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کمی نہ کی۔ عیسائیوں نے ہرقل کو ابھارا کہ وہ یہودیوں کی بیخ کنی کرے اور اس کے اچھے پہلو اس کے سامنے واضح کیے۔ ہرقل نے نے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ وہ انہیں امان دے چکا ہے اور اس نے ان سے حلفیہ وعدہ کیا ہے۔ عیسائیوں کے پادریوں' پوپوں اور مشائخ نے فتویٰ دیا کہ یہودیوں کو قتل کرنے میں کوئی

گناہ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے ہرقل سے یہ امان دھوکہ دے کر حاصل کی ہے' اس لئے کہ ہرقل کو یہ نہیں بتایا گیا کہ عیسائیوں پر کیا کیا مظالم ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ہرقل کے کفارے کے طور پر یہ سال ایک جمعہ کو روزہ رکھا کریں گے۔ یہ روزہ لازمی ہو گا۔ اور تمام عیسائیوں کو اس کا پابند بنائیں گے۔ تب ہرقل نے ان کی بات مان لی اور یہودیوں پر شدید حملہ کیا اور انہیں نیست و نابود کر دیا۔ چنانچہ مصر و شام کی رومی سلطنت میں کوئی یہودی زندہ نہ بچا۔ سوائے ان کے جو بھاگ کر کہیں چھپ گئے۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں قومیں یہود و نصاریٰ سنگدل' انسانی خون بہانے کی ہوس اور دشمن کو تباہ کرنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور اسی معاملے میں یہ کسی حد پر جا کر نہیں رکتے"۔ ماذا حسر العالم استاذ ندوی' ص ۹ تا ۱۱' طبع اول)

اس کے بعد عیسائیوں کے درمیان اختلافات پیدا ہونا شروع ہو گئے' حالانکہ ان کی کتاب بھی ایک تھی' نبی بھی ایک تھا' سب سے پہلے ان کے اختلافات بنیادی عقائد میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد وہ فرقے فرقے بن گئے۔ یہ فرقے ایک دوسرے سے سخت نفرت کرتے' ایک دوسرے کے سخت دشمن بن گئے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات اور ماہیت کے بارے میں اختلافات پیدا ہوئے کہ ان کی ماہیت لاہوتی ہے یا ناسوتی۔ پھر ان کی ماں کی ماہیت کے بارے میں اختلافات رونما ہوئے۔ پھر ٹرینٹی یعنی تثلیث کے مسئلہ پر اختلافات ہوئے۔ ان کے خیال میں خدا تینوں کا ایک تھا۔ قرآن کریم نے ان کے ان عقائد کو نقل کر کے واضح طور پر کہا ہے کہ یہ لوگ کافر ہو گئے ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (۵ : ۷۲) "یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تو یہی مسیح ابن مریم ہیں"۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (مائدہ : ۷۳) "یقیناً وہ لوگ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین کا تیسرا ہے"۔

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (مائدہ : ۱۱۶) "اور اس بات کو یاد کرو جب اللہ قیامت کے دن عیسیٰ ابن مریم سے کہے گا' کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا خدا بنا لو"۔

ان اختلافات کے نتیجے میں وہ شدید ترین تنازعہ پیدا ہوا جو شام کے عیسائیوں اور روم اور مصر کے عیسائیوں کے درمیان پیدا ہوا۔ اس کا ایک فریق روم اور شام کے ملکانی عیسائی تھے اور دوسرا فریق مصر کا منوفیشی فرقہ تھا۔ ملکانی عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت مسیح کی فطرت کے دو اجزاء ہیں ایک ملکوتی اور دوسرا ناسوتی جبکہ مصر کے منوفیشی عیسائی کہتے تھے کہ ان کی ایک ہی فطرت ہے جو اس طرح فنا ہو گئی جس طرح سرکے کا ایک قطرہ سمندر میں گر کر فنا ہو جاتا ہے۔ چھٹی اور ساتویں صدی میں یہ اختلاف ان دو فرقوں کے درمیان بہت شدت اختیار کر گیا"۔ اور یوں نظر آنے لگا کہ یہ دو

فرقے نہیں بلکہ دو الگ الگ دین و مذہب ہیں۔جس طرح یہودی اور عیسائی دو الگ الگ اہل مذہب ہیں اور ہر ایک دوسرے کے بارے میں یہ تصور کرتا ہے کہ اس کے مذہب کی کوئی بنیاد نہیں ہے"۔ (مسلمانوں کا عروج و زوال' ابو الحسن علی ندوی)

"۶۲۸ء میں ہرقل نے ایرانیوں پر فتح پائی' اس کے بعد اس نے عیسائیوں کے باہم برسرپیکار اور متحارک مسلکوں کو جمع کرنے اور ان کے اند موافقت اور مصالحت پیدا کرنے کی سعی کی۔فیصلہ یہ ہوا کہ لوگ حضرت مسیح کی فطرت کے موضوع پر بحث کرنے سے پرہیز کریں' کہ ان کی فطرت ایک تھی یا دو تھیں۔وہ اس بات کا اقرار کریں کہ اللہ کا ارادہ اور فیصلہ ایک ہی ہے۔۶۳۱ء کے اوائل میں یہ بات طے ہوگئی کہ مینوتھیلین مذہب ہی حکومت اور کلیسا دونوں کا سرکاری مذہب ہو گا۔ ہرقل نے مختلف فرقوں کو ختم کر کے ایک مسلک پر ہونے کی سعی کی اور اس کے لیے ہر حربہ استعمال کیا' مگر مصر کے قبطیوں نے اس بدعت اور تحریف سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا اور شدید مخالفت کی' اور اپنے پرانے عقیدے کو جاری رکھنے کے لیے جان کی بازی لگا دی۔یہ لوگ اس کے دشمن ہوگئے۔ ہرقل نے دوبارہ مختلف فرقوں کو ایک کرنے کی کوشش کی۔اس نے اس بات پر زور دیا کہ لوگ صرف اس پر متحد ہو جائیں کہ اللہ کا ارادہ ایک ہے۔رہا یہ کہ اللہ کا ارادہ نافذ کس طرح ہوتا ہے۔اس پر بحث نہ کی جائے۔اس نے حکم دیا کہ اس موضوع پر کوئی مناظرہ نہ کیا جائے۔ایک سرکاری پیغام مرتب کر کے مشرق کے اطراف و اکناف میں پھیلایا۔اس سے بھی مصر کا مذہبی طوفان نہ رک سکا۔اس پر اسے غصہ آیا اور دس سال تک وہ مصر کے لوگوں پر شدید ترین ظلم اور ستم کرتا رہا۔اس نے جو مظالم کیے ان کی روئیداد پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔لوگوں کو اذیت ناک سزا دی جاتی' پھر انہیں دریا میں غرق کر دیا جاتا۔ مشعل جلا کر ان کے جسموں پر بچھائی جاتی۔یہاں تک کہ بدن کی چربی پگھل کر زمین پر گرتی۔ریت کے بوروں میں قیدیوں کو بند کر کے دریا برد کر دیا جاتا اور اس طرح کی دوسری لرزہ خیز سزائیں دی جاتیں"۔ (ماذا احسر العالم ابو الحسن ندوی' ص ۳ تا ۵)

اہل کتاب کے درمیان یہ اختلافات اور یہ عداوتیں اس کے بعد تھیں کہ ان کے پاس دلائل آچکے تھے۔

مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ (۹۸ : ٤) لیکن یہ علم اور یہ دلائل ان کے لیے مفید نہ تھے' خواہش نفس اور گمراہی ان کو حق سے دور کرتی چلی جا رہی تھی۔حالانکہ دین اپنی اصلی اور ابتدائی شکل میں بالکل واضح تھا اور دینی عقائد بالکل واضح اور صاف تھے۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝

"اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں' اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے' بالکل یکسو ہو کر' اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔یہی نہایت صحیح و درست دین ہے"۔

یہ اصول تمام ادیان کا اصل الاصول ہے کہ اللہ وحدہ کی عبادت کرو' دین صرف اللہ کا ہو' شرک اور اہل شرک سے

دور ہو' نماز قائم کرو' زکوٰۃ ادا کرو۔

وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (۹۸: ۵) "یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے" یعنی انسانی ضمیر و شعور میں عقیدہ خالص ہو۔ صرف اللہ کی بندگی اور غلامی ہو' جو اس عقیدے پر مبنی ہو' اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا جائے' یعنی زکوٰۃ دی جائے۔ جس شخص نے بھی ان اصولوں کو حقیقت کا روپ دے دیا تو اس کا ایمان قائم ہو گیا' جس طرح اہل کتاب کو اس کا حکم دیا گیا تھا۔ اور جس طرح اللہ کے تمام رسولوں کو یہی حکم دیا گیا تھا اور تمام رسولوں اور امتوں کا دین دراصل ایک ہے' عقیدہ ایک ہے' جس پر تمام رسولوں کا اجماع رہا ہے اور اس عقیدے اور عمل میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس میں افتراق و اختلاف کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ بے حد صاف ستھرا' سادہ اور آسان ہے۔ لہٰذا اہل کتاب کے ہاں زیر بحث اور زیر جدال عقائد کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ اللہ کے دین میں وہ چیزیں ہیں۔

ان لوگوں کے پاس اس سے قبل ان کے رسولوں کے ذریعہ بھی دلائل آ گئے تھے۔ اس کے بعد پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھی یہ دلائل آ گئے تھے جو پاکیزہ صحیفے پڑھتے ہیں اور ان کے سامنے ایسے عقائد پیش کرتے ہیں جو واضح' سادہ اور آسان ہے لہٰذا صحیح راستہ واضح ہو گیا اور جو لوگ کفر کرتے ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔ ان کا انجام بھی واضح ہو گیا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ
خٰلِدِينَ فِيهَا ؕ أُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝٦ إِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَ عَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ ۙ أُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝٧ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ
عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ
ع ۸ رَضُوا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ ۝٨

۲۳ "اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ یقیناً جہنم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے' یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔ جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کیے' وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں۔ ان کی جزا ان کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ کچھ ہے اس شخص کے لیے جس نے اپنے رب کا خوف کیا ہو"۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری رسول ہیں اور جو دین لے کر آئے ہیں وہ آخری دین ہے اس سے قبل یوں تھا کہ جب بھی انسانیت گمراہ ہوتی اور راستے سے ہٹ جاتی اللہ رسول بھیج دیتا' یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا اور لوگوں کو وقفے وقفے سے مہلت ملتی رہی کہ لوگ اپنی اصلاح کر لیں لیکن اللہ کی مشیت کا تقاضا یہ ہوا کہ ایک جامع' مانع اور مکمل دین بھیج کر رسولوں کے اس سلسلے کو ختم کر دے۔ یہ آخری مہلت ہے۔ لوگ اس آخری دین کو قبول کر کے نجات پا لیں گے یا انکار کر کے ہلاک و برباد ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ کفر اور شرک شر کے قائم مقام اور شر کی علامت بن جاتا ہے اور شر کی

کوئی حد نہیں ہوتی اور ایمان خیر کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ اور ایمان کے نتیجے میں خیر اپنی انتہاؤں تک پہنچ جاتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا اُولٰٓئِکَ ھُمْ شَرُّ الْبَرِیَّۃِ (۹۸ : ۶) ”اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ یقیناً جہنم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے ‘یہ لوگ بدترین خلائق ہیں“۔ یہ ایک قطعی حکم ہے اور اس میں کوئی جدل و جدال نہیں ہے۔ اگرچہ اہل کتاب اور مشرکین کے بعض اعمال اچھے ہوں ‘بعض آداب خوب ہوں اور بعض تنظیمات مفید ہوں۔ جب تک ان لوگوں کو حقیقت ایمان حاصل نہیں ہوتی۔ اور وہ اس آخری دین اور آخری نبی پر ایمان نہیں لاتے۔ اس اٹل حکم میں ہم محض لوگوں کے بعض ظاہری اچھے اعمال کی وجہ سے شک نہیں کر سکتے اس لیے کہ کفار کے اعمال دراصل نیکی اور بھلائی کے اصل سرچشمے سے دور ہوتے ہیں۔ اور وہ ایک مضبوط اور درست نظام زندگی کا حصہ نہیں ہوتے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ (۹۸ : ۷) ”جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں“۔ یہ بھی ایک قطعی حکم ہے جس میں کسی قیل و قال کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کی شرط بھی واضح ‘صاف اور اٹل ہے۔ یعنی یہ کہ جو ”ایمان“ لے آئیں۔ یہ نہ ہو کہ وہ کسی ایسی سرزمین میں پیدا ہوئے ہوں جو مسلمان سرزمین ہونے کی مدعی ہو ‘یا کسی ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے ہوں جس کا دعویٰ یہ ہو کہ وہ مسلمان گھرانا ہے یا محض یہ کہ کوئی چند کلمات ادا کرتا ہو ‘نہیں بلکہ ایسا ایمان جو زندگی کے اندر عملاً نمودار ہوتا ہو۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ”اور انہوں نے نیک کام کیے“۔ اور ان کا ایمان اور اقرار ایمان محض الفاظ اور کلمات ہی نہ ہوں ‘جو صرف ہونٹوں پر ہوتے ہیں ‘صالحات وہ افعال ہیں جن کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہو ‘جن میں اخلاق بھی ہوں ‘ اعمال بھی ہوں اور طرز عمل اور معالات بھی ہوں اور اعمال میں سب سے بڑا عمل یہ ہے کہ اللہ کی شریعت کو زمین پر قائم کیا جائے اور لوگوں کے درمیان فیصلے اللہ کی شریعت کے مطابق ہوں۔ جو لوگ یہ کام کریں وہ ہیں بہترین خلائق۔

جَزَآؤُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا (۹۸ : ۸) ”ان کی جزاء ان کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے“۔ ایسے باغات جن کی نعمتوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہاں مکمل امن ہو گا۔ اور ان کے فنا ہونے اور رک جانے کا کوئی خطرہ نہ ہو گا۔ فنا ہونے اور امن و اطمینان کا ختم ہو جانا ہی دنیا کی تمام سہولیات اور طیبات کا مزہ خراب کر دیتا ہے اور ان تروتازہ باغوں کے نیچے نہروں کا بہنا ‘اس طرف اشارہ ہے کہ ان باغات میں تازگی اور بہار دائمی ہو گی اور یہ زندگی اور جمال سے بھرپور ہوں گے۔

اس دائمی نعمت و رحمت کی تصویر کشی میں سیاق کلام دو قدم اور آگے جاتا ہے۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّہٗ (۹۸ : ۸) ”اللہ ان سے راضی ہو

اور وہ اللہ سے راضی ہوئے"۔ یہ رضامندی اللہ کی جانب سے ہے اور یہ تمام نعمتوں سے برتر اور تمام خوشیوں سے تروتازہ ہے۔ خود ان اہل ایمان کے دلوں میں جو رضامندی ہے وہ رب کی رضامندی ہے۔ اور یہ رضامندی ہے کہ ان کے بارے میں تقدیر الٰہی جو فیصلہ کرتی ہے وہ اس پر راضی ہیں۔ اور اللہ نے ان پر جو انعامات کیے ہیں اس پر بھی وہ راضی ہیں اور اپنے اور اللہ کے درمیان پائے جانے والے تعلق پر بھی راضی ہیں۔ یہ ایسی رضامندی ہے کہ اس سے انسان گہری خوشی اور مسرت و اطمینان محسوس کرتا ہے۔ یہ انداز کہ "اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں"۔ ایک ایسا انداز ہے جس کی تعبیر کسی دوسرے الفاظ میں نہیں کی جا سکتی۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ (۸:۹۸) "یہ کچھ ہے اس شخص کے لیے جو اپنے رب کا خوف کرتا ہو"۔ یہ آخری تاکید ہے' یہ کہ یہ سب کچھ اس پر موقوف ہے کہ کسی کا تعلق باللہ کیسا ہے۔ اور اس تعلق کی نوعیت کیسی ہے۔ یاد رہے کہ کسی دل میں جب خدا کے خوف کا شعور پیدا ہوتا ہے تو یہ شعور انسان کو نیکی پر آمادہ کرتا ہے اور ہر قسم کی کج روی سے انسان کو روکتا ہے۔ یہی شعور ہے جو انسان کی آنکھوں کے سامنے سے تمام پردے ہٹا دیتا ہے۔ اور انسان کا دل اللہ واحد و قہار کے سامنے براہ راست کھڑا ہوتا ہے' اور اس شعور کی وجہ سے انسان کی عبادت اور اس کے اعمال صالحہ ہر قسم کی شرک' ریاکاری سے پاک ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ جو شخص اپنے رب سے ڈرتا ہے۔ اس کا دل غیراللہ کے ڈر سے خالی ہو جاتا ہے' کسی دوسرے کی رو رعایت وہ نہیں کرتا۔ یہ شعور انسان کو یہ یقین دلا دیتا ہے کہ اللہ تمام ایسے اعمال کو رد کر دیتا ہے جن میں اس کی رضامندی کے سوا کوئی اور جذبہ بھی ہو' اللہ غنی بادشاہ ہے' اس کے لیے تو خالص عمل ہو گا ورنہ وہ اسے رد کر دے گا۔

اس مختصر سی سورت میں یہ چار عظیم حقائق قلم بند کیے گئے ہیں اور قرآن نے ان حقائق کو اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کیا ہے اور یہ اسلوب ان چند سطروں والی سورت میں بہت اچھی طرح نمایاں ہے۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۂ الزلزال ـ ۹۹

۱--- تا--- ۸

سورۂ الزلزال ایک نظر میں

بعض مصاحف اور بعض روایات کے مطابق یہ سورہ مدنی ہے اور بعض دوسری روایات کے مطابق یہ مکی ہے۔ ہمارے نزدیک وہ روایات قابل ترجیح ہیں جو کہتی ہیں کہ یہ سورت مکی ہے۔ اس کا انداز گفتگو اور اس کا موضوع دونوں یہ تقاضا کرتے ہیں کہ یہ مکی ہے۔ یہ سورت دراصل غافل دلوں کے لیے ایک سخت جھٹکا ہے۔ موضوع سخن، انداز کلام اور منظرکشی اور لفظی اثرات سب کے سب انسانی قلوب کو جھنجھوڑتے ہیں۔ یہ سورت دراصل ایک چیلنج ہے، ایک سخت پکار ہے جو زمین اور اہل زمین کے اندر ایک زلزلہ پیدا کر دیتی ہے۔ اور لوگ گویا مدہوش ہو جاتے ہیں اور جب وہ ہوش میں آتے ہیں تو وہ میدان حشر میں حساب و کتاب کے لیے اپنے آپ کو کھڑا پاتے ہیں اور چند مختصر فقروں میں یہ سب کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پورے پارے میں ایسا ہی انداز گفتگو ہے اور یہ سورت گویا اس انداز کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

درس نمبر ۲۹۹ تشریح آیات

۱-- تا-- ۸

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝۱ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝۲ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۝۳ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝۴ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝۵

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

''جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی' اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی' اور انسان کہے گا کہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے؟ اس روز وہ اپنے (اوپر گزرے ہوئے) حالات بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اسے (ایسا کرنے کا) حکم دیا ہو گا۔

یہ ہے منظر قیام قیامت کا' اس دن زمین نہایت شدت سے ہلا ماری جائے گی اور ایک شدید زلزلہ برپا ہو گا اور زمین کے پیٹ کے اندر جو کچھ ہو گا' وہ اسے باہر پھینک دے گی اور اس نے ایک طویل عرصے سے انسانی جانوں کا جو بوجھ اٹھا رکھا ہو گا' یا اس کے اندر جو معدنیات ہوں گے وہ ان کو اٹھا کر باہر پھینک دے گی' گویا اس بوجھ کو باہر پھینک کر وہ ہلکی ہو جائے گی۔

یہ ایک ایسی تصویر کشی ہے کہ سننے والے اپنے پاؤں کے نیچے کھڑی ہر چیز متزلزل محسوس کرتے ہیں کہ وہ ڈگمگا رہے ہیں' لڑکھڑا رہے ہیں' ان کے قدموں کے نیچے سے زمین کانپ رہی ہے' دوڑ رہی ہے' یہ ایک ایسا منظر ہے جس کو دیکھ کر انسان ان تمام امور سے قطع تعلق کر لیتا ہے جو انسان کو اس زمین سے وابستہ کرتے ہیں اور جن کے بارے میں انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ ثابت اور باقی ہیں۔ قرآن اس قسم کے مناظر سے جو اثرات قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ ان میں سے پہلا اثر ہے اور قرآن کی یہ منفرد آیات سنتے ہی یہ اثر انسان کے اعصاب تک منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ تاثر اس وقت اور گہرا ہو جاتا ہے۔ جب قرآن کریم میدان حشر میں کھڑے اس ''انسان'' کے تاثرات قلم بند کرتا ہے' جو ان مناظر کو دیکھ رہا ہو گا۔

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا (۹۹: ۳) ''اور انسان کہے گا' یہ اس کو کیا ہو رہا ہے؟'' یہ ایک ایسے شخص کا

سوال ہے جو ایک اچانک ' خوفناک منظر کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتا ہے ' جو ایسا منظر دیکھ رہا ہوتا ہے جو نادیدنی ہو' جو ایسی صورت حالات سے دوچار ہوتا ہے جس کو وہ سمجھ نہیں پا رہا ہوتا' اور ایک ایسے منظر کو دیکھ رہا ہوتا ہے' جس پر وہ نہ خاموش ہو سکتا ہے' اور نہ صبر کر سکتا ہے۔

مَالَهَا (۹۹ : ۳) "اسے کیا ہو گیا ہے"۔ کیا سبب ہے کہ ایک زلزلہ برپا ہے اور زمین ہے کہ مسلسل حرکت کر رہی ہے اور اس کے قدم ہی نہیں جمتے اور وہ ادھر ادھر لڑھک رہا ہے اور کوشش کر رہا ہے کہ جو سہارا ہاتھ میں آئے اسے لے' لیکن اس کے ماحول میں ہر چیز حرکت کر رہی ہے' اور شدید زلزلے کی زد میں ہے۔

انسان نے اس سے قبل زلزلے اور آتش فشانی کے عمل دیکھے ہوئے تھے اور زلزلے اور آتش فشانی کے دوران خوف اور بے چینی سے وہ دوچار رہا ہے۔ اس نے ہلاکتیں اور بربادیاں دیکھی ہیں لیکن جب وہ قیامت کا زلزلہ دیکھتا ہے تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ دنیا کے زلزلوں اور آتش فشانیوں اور اس کی موجودہ حادثے کے درمیان کوئی مماثلت نہیں ہے۔ یہ کوئی اور ہی عمل ہے' کوئی اور ہی حادثہ ہے۔ اس حادثے کا کوئی حقیقی سبب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ نہ اس کی کوئی مثال ہے۔ یہ ایک نہایت ہی ہولناک واقعہ ہے اور پہلی مرتبہ پیش آ رہا ہے۔

یَوْمَئِذٍ (۹۹ : ٤) "اس دن"۔ جس دن یہ زلزلہ واقعہ ہو گا اور انسان اس کے سامنے دہشت زدہ ہو گا۔ اس دن۔

تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا (۹۹ : ٤) "وہ اپنے (اوپر گزرے ہوئے) حالات بیان کرے گی"۔ اس دن یہ زمین اپنی خبریں دے گی اپنے حالات بتائے گی اور اپنی پوری کہانی بیان کرے گی۔

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (۹۹ : ۵) "کہ تیرے رب نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا ہو گا"۔ اس کو حکم دیا ہو گا کہ وہ اپنی حرکت تیز کر دے اور اپنے سکان کو خوب جھٹکے دے اور اپنے اندر کی چیزیں باہر پھینک دے اور یہ کام وہ رب کے حکم کی اطاعت میں کر رہی ہے۔

وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ "اور وہ اپنے رب کے حکم کی اطاعت کرے گی اور اس کا حق یہی ہے"۔ لہٰذا وہ اپنے حالات بتائے گی۔ غرض یہ صورت حال اور یہ منظر اس بات کا خوب اظہار کر رہا ہے کہ اس وقت اللہ کے احکام و اشارات کیا ہوں گے۔

اب یہاں حالات ایسے ہیں کہ انسان ششدر رہ گیا ہے' سورت کی گھن گرج اور زوردار بیان سے خوف و ہراس کی فضا ہے' ہر سو دہشت اور حیرانی کا دور دورہ ہے۔ اضطراب اور بھگدڑ ہے' ایسے حالات میں انسان کا سانس پھولا ہوا ہے۔ اور وہ پوچھ رہا ہے کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔

مَالَهَا (۹۹ : ۳) "اسے کیا ہو گیا ہے--- ایسے حالات میں جواب ایک نئے منظر کی صورت میں آتا ہے' یہ ہے منظر حشر و نشر' حساب و کتاب اور میزان و جزاء کا ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ﴿٦﴾ فَمَنْ
يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ﴿٧﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا ۱
يَّرَهٗ ﴿٨﴾ ع ۸ ع
۲۴

"اس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں ۔ پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا"۔

ایک لمحہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ قبروں سے اٹھتے چلے آرہے ہیں ۔

یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا (۹۹ : ۶) "اس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے"۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مختلف گروہوں مختلف اطراف سے چلے آرہے ہیں ۔ یوں لگتا ہے کہ گویا وہ بکھری ہوئی ٹڈیاں ہیں ۔

کَاَنَّھُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ "گویا کہ یہ لوگ بکھری ہوئی ٹڈیاں ہیں" یہ ایک ایسا منظر ہے جو اس سے قبل انسان نے کبھی نہیں دیکھا' یہ کہ لوگوں کی نسلیں' اگلوں پچھلوں کی یہاں سے اور وہاں سے اٹھ رہی ہیں ۔ جس طرح دوسری جگہ آیا ۔

یَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْھُمْ سِرَاعًا "وہ دن جبکہ زمین پھٹے گی اور وہ اس میں سے تیزی تیزی سے نکل بھاگیں گے"۔ منظر یوں ہے کہ تاحد نظر انسان ہی انسان نظر آتے ہیں ۔ جو قبروں سے اٹھ رہے ہیں اور تیزی سے بھاگ رہے ہیں ۔ کسی طرف کسی کو توجہ نہیں ہے ۔ آگے اور پیچھے' دائیں اور بائیں کچھ نہیں دیکھ رہے ہیں ۔ نظریں اٹھی ہوئی ہیں ۔

مُّھْطِعِیْنَ اِلَی الدَّاعِ "پکارنے والے کی طرف سر اٹھائے تیزی سے دوڑ رہے ہیں"۔ گردنیں بلند کی ہوئی' نظریں پھٹی ہوئی ۔

لِکُلِّ امْرِیءٍ مِّنْھُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ (۸۰ : ۳۷) "ہر شخص کو اس دن بس اپنی پڑی ہوگی"۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جس کی تصویر کشی کسی انسانی زبان میں نہیں کی جاسکتی ۔ "ہولناک" اور "خوفناک"' "حیرت زدہ کر دینے والا" اور "مدہوش کر دینے والا"۔ غرض یہ اور اس قسم کے تمام دوسرے الفاظ اس منظر کی تصویر کشی سے عاجز ہیں ۔ ہاں صرف خیال و تصور کو ہم کسی قدر آگے بڑھا سکتے ہیں اور اس منظر کی تصویر کشی میں الفاظ کی بجائے خیال کی جولانی ہو سکتی ہے ۔ اپنی وسعت اور طاقت کے حدود کے اندر اندر ۔

یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّیُرَوْا اَعْمَالَھُمْ (۹۹ : ۶) "اس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں"۔ اور یہ پھر اس منظر سے بھی شدید تر بات ہے ۔ اف' ان کے سامنے تو ان کے اعمال پیش ہو رہے ہیں! کیا یہ اپنے اعمال کا سامنا کر سکیں گے؟ کیا اس سزا کا مقابلہ کر سکیں گے ۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لیے بعض اوقات خود اپنے اعمال کا مقابلہ نہایت ہی تلخ ہوتا ہے ۔ انسان بعض اوقات خود اپنے اعمال کا

سامنا کرنے سے بھاگتا ہے حالانکہ لوگوں کو ان کا پتہ نہیں ہوتا' لیکن جب توبہ و ندامت کے وقت خود انسان کے اعمال اس کے سامنے آکر کھڑے ہوتے ہیں تو وہ سخت نادم ہوتا ہے' اپنی نفسیات' اپنے ضمیر سے بھاگتا ہے' چہ جائیکہ کھلی عدالت میں اسے پیش ہونا ہو اور سب کے سامنے اس پر فرد جرم لگتا ہو اور عدالت کا سربراہ رب ذوالجلال ہو جو جبار اور متکبر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی کو اس کا عمل دکھانا بھی دراصل ایک خوفناک سزا ہے' صرف یہ بات کہ کوئی اپنا جتھا دیکھے اور جو کچھ اس نے کیا ہے اس کا سامنا کرے۔ خصوصاً ایسے اوقات میں جبکہ حساب و کتاب ایسا ہو کہ اس میں ذرہ ذرہ درج ہو' نہ شر کا ذرہ چھوڑا گیا ہو اور نہ خیر کا ذرہ چھوڑا گیا ہو۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (۷) وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۹۹ : ۷ ۔ ۸) "پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا"۔ پرانے مفسرین ذرے کی تفسیر مچھر کے برابر کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے ذرہ وہ اڑنے والا چھوٹا ایٹم ہے جو سورج کی روشنی میں نظر آیا کرتا ہے۔ دراصل اس دور میں یہ وہ چھوٹی سے چھوٹی مقدار تھی جس کا وہ لوگ تصور کر سکتے تھے لیکن آج کے جدید زمانے میں ہم جانتے ہیں کہ ذرہ کیا ہے۔ وہ ایک متعین جسم ہے اور یہ یہ ذرہ سے بہت چھوٹا ہے جو فضا میں اڑ رہا ہوتا ہے اور جو سورج کی روشنی میں نظر آتا ہے اس لیے کہ ہوا میں اڑنے والی یہ چھوٹی سی مقدار محض آنکھ سے دیکھی جا سکتی ہے۔ رہے ایٹم تو وہ صرف خوردبین کے ساتھ لیبارٹری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ سائنس دان اس ذرے کو دراصل اپنے ذہن اور عقل سے دیکھتے ہیں اور اس کے آثار کو آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ پس قیامت کے دن اس ذرے یعنی ایٹم جتنی بھلائی یا برائی کی کوئی بھی جزاء و سزا ہوگی۔ یہ چھوٹی سی نیکی اور بدی بھی اس کے کرنے والے کے سامنے پیش ہوگی۔ اور وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔

یہاں آکر ہر انسان چوکنا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے خیر و شر سے غافل نہیں رہتا' اور یہ نہیں کہتا کہ یہ تو چھوٹا سا عمل نیک ہے یا یہ تو چھوٹی سی برائی ہے اور اس کا کوئی حساب و کتاب نہ ہوگا۔ اس نہایت ہی باریک اور لطیف ترازو کے سامنے ہر شخص کانپ اٹھتا ہے کہ جہاں ذرے کو بھی تولا اور ناپا جائے گا۔

اس جہاں میں تو ایسی کوئی میزان نہیں ہے جو اس قدر ناقابل وزن ذرے کو بھی ناپ اور تول سکے۔ البتہ قلب مومن میں جو تقویٰ کا میزان ہے وہ ذرے کو ہی ناپتا اور تولتا ہے۔ کیونکہ ایک مومن تو ذرے کے برابر گناہ سے بھی ڈرتا ہے۔ افسوس کہ اس جہاں میں ایسے سخت دل بھی ہیں جو پہاڑوں جیسے جرائم سے بھی نہیں ڈرتے' بلکہ ایسے سنگدل لوگ بھی ہیں جو خیر کے ایسے ایسے پہاڑوں کو بھی مٹانے کے درپے ہیں جن کے سامنے اس زمین کے اونچے اونچے پہاڑ بھی ہیچ ہیں۔

یہ نہایت ہی سخت دل ہیں' پتھروں جیسے سخت۔ یہ پتھروں کی طرح زمین کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں اور یہ دل جب قیامت کے دن آئیں گے تو اپنے گناہوں کے بوجھوں کے نیچے پس کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ (۱)

---

(۱) یہ پیراگراف خود سید قطب پر صادق آتا ہے جسے قسی القلب ناصر نے اس جہاں سے منایا' حالانکہ وہ نیکی کے ایک بلند پہاڑ تھے۔

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ العٰدیٰت ـ ۱۰۰

۱--- تا --- ۱۱

سورۂ العٰدیٰت ایک نظر میں

اس سورت کا سیاق کلام نہایت سریع الحرکت جھلکیوں کے انداز میں چلتا ہے ۔ انداز نہایت سخت اور نہایت موثر ہے جس طرح کوئی ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف کودتا ہے یا چھلانگ لگاتا ہے ' نہایت ہلکے انداز میں ' تیزی کے ساتھ اور آگے بڑھتے ہوئے ۔ یہاں تک کہ یہ جھلکیاں آخر تک پہنچ جاتی ہیں ۔ آخری فقروں میں الفاظ ' معانی ' موضوع اور اثرات تھم کر پرسکون ہو جاتے ہیں ' جس طرح گھوڑ دوڑ میں مقابلہ جیت کر دوڑنے والا آخر کار پرسکون ہو جاتا ہے ۔

ذرا غور سے دیکھئے اس منظر کو ' صبح سویرے کا وقت ہے ۔ گھوڑے جنگجو سواروں کو لیے ہوئے تیزی سے دوڑ رہے ہیں اور ہانپ رہے ہیں ۔ ان کی ٹاپوں سے چنگاریاں اٹھ رہی ہیں ' غبار دھویں کی طرح آسمانوں تک اڑ رہا ہے ۔ وہ دیکھو یہ سوار دشمن کی صفوں میں گھس گئے ۔ دشمن کو حملے کی توقع نہیں ' دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی ' جس کا منہ جدھر ہے ادھر بھاگ رہا ہے ۔

اس عجیب منظر کے کرداروں کی قسم کھاتے ہوئے ' نفس انسانی کی ایک جھلک ' کہ یہ سخت منکر اور کافر ہے ' اور اس کے ساتھ ساتھ دولت کا پجاری ہے ۔

اور اس کے بعد ایک دوسرا منظر زمین اور قبرستان پھٹ رہے ہیں اور لوگ ان میں سے چیونٹیوں کی طرح باہر نکل رہے ہیں ' پھر انسانی دل و دماغ پھٹ رہے ہیں اور ان میں پوشیدہ تمام راز اگلے جا رہے ہیں ۔

سورت کے آخر میں منظر یہ ہے کہ گرد و غبار چھٹ جاتا ہے ۔ انکار وجود اور حرص و بخل ختم ہو جاتے ہیں ۔ لوگ تمام کے تمام قبروں سے نکل کر جمع ہو جاتے ہیں ۔ اور سب کے سب اللہ کے سامنے کھڑے ہیں ۔ اور آخری انجام یہ ہے ۔

اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ (۱۰۰ : ۱۱) "یقیناً ان کا رب ان سے اس دن خوب باخبر ہے" ۔

الفاظ کے ترنم میں بھی سختی ' خشونت اور کرختگی ہے ۔ اور یہ اس شور و شغب کی فضا سے ہم آہنگ ہے جو قبروں کی اکھاڑ اور لوگوں کے خروج سے پیدا ہوتی ہے ۔ یہ اس فضا سے بھی متناسب ہے جس میں دلوں سے خفیہ راز بری شدت سے نکالے جا رہے ہیں ۔ پھر انکار و ہٹ دھرمی اور بخل اور دولت پرستی کی فضا سے بھی ہم آہنگ ہے ۔ ان سب درشت معانی کی تصاویر کو سجانے کے لیے جو فریم تجویز ہوا ہے وہ قبروں سے نکلنے کے ہائے و ہو ' اور ایسے تیز رفتار گھوڑ سواروں کے شور سے تیار ہوا ہے جن کے کھروں کی ٹکر سے چنگاریاں اٹھ رہی ہیں اور علی الصبح دشمن پر حملہ آور ہوتے ہیں ' جو گرد و غبار اڑاتے ہیں ' جو دشمن کے اندر جا گھستے ہیں اور دشمن کی توقع ہی نہیں ہوتی ' غرض ان سخت و کرخت معانی کے لیے یہ مناسب فریم ہے ۔ گو فریم تصویر سے لی گئی ہے اور تصویر فریم کے کرخت میٹریل سے بنی ہے ۔ (التصویر الفنی فی القرآن)

---ooo---

درس نمبر ۳۰۰ تشریح آیات

۱-- تا-- ۱۱

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۝۱ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۝۲ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۝۳ فَاَثَرْنَ بِهٖ
نَقْعًا ۝۴ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝۵ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝۶ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ
لَشَهِيْدٌ ۝۷ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝۸

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"قسم ہے ان (گھوڑوں) کی جو پھنکارے مارتے ہوئے دوڑتے ہیں' پھر (اپنی ٹاپوں سے) چنگاریاں جھاڑتے ہیں' پھر صبح سویرے چھاپہ مارتے ہیں' پھر اس موقع پر گرد و غبار اڑاتے ہیں' پھر اسی حالت میں کسی مجمع کے اندر جا گھستے ہیں' حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے' اور وہ خود اس پر گواہ ہے' اور وہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے"۔

اللہ تعالیٰ یہاں سواروں کے دستے کی قسم اٹھاتے ہیں۔ ان کی ایک ایک جنگی حرکت کو ترتیب کے ساتھ لایا جاتا ہے۔ جب یہ دستہ اپنے حملے کا آغاز کرتا ہے اور تیز رفتاری کے ساتھ منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ گھوڑے پھنکار مارتے آگے جا رہے ہیں۔ یہ اپنے سموں سے پتھروں سے چنگاڑیاں نکالتے جاتے ہیں۔ پھر عین صبح کے وقت یہ دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہیں' یہ حملہ نہایت سرعت کے ساتھ ہوتا ہے اور اچانک ہوتا ہے۔ حملہ کے وقت گھوڑوں کی بھگدڑ سے غبار اڑتا ہے۔ کیونکہ دشمن حملے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور اس کی حرکات غیر مرتب ہیں' جب یہ دستہ دشمن کی صفوں میں خلاف توقع جا گھستا ہے تو سخت انتشار و اضطراب برپا ہو جاتا ہے۔

یہ کسی بھی حملہ کے وہ پے درپے اقدامات ہیں جن سے عرب خوب واقف تھے۔ اس قسم کے دستے اور گھوڑوں کی حرکات کی قسم کھانے کا مطلب یہی ہوا کہ اسلام میں اس قسم کے معرکے بہت محبوب ہیں' یہ اللہ کو بھی محبوب ہیں' اللہ ایسی حرکات کو اچھی نظروں سے دیکھتا ہے اور یہ پسندیدہ قدریں ہیں۔

پھر' یہ مناظر اور جنگی ایکشن ان معانی سے زیادہ ہم آہنگ ہیں جن پر یہاں قسم اٹھائی جا رہی ہے' جیسا کہ ہم نے تبصرے میں وضاحت کی۔جس مفہوم اور معنی پر قسم اٹھائی جا رہی ہے۔یہ انسان کی ایک نفسیاتی بیماری ہے اور یہ انسان کو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب انسان نفسیات ایمان سے خالی ہوں۔قرآن مجید اس حقیقت کی طرف بار بار اشارہ کرتا ہے تا کہ لوگ اس کے خلاف جدوجہد کریں۔اس لیے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ انسانی نفسیات کے اندر یہ بیماری کس قدر گہری جڑیں رکھتی ہیں۔اور انسانی شخصیت پر اس کے کتنے اثرات ہوا کرتے ہیں۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (٦) وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ (٧) وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (٨) (۱۰۰: ٦ تا ٨) "حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے اور وہ خود اس پر گواہ ہے اور وہ مال اور دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے"۔بے شک انسان اپنے رب کی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے اور اللہ کے فضل وکرم کا عملی انکار کرتا ہے۔اور اس کی یہ ناشکری اور کفران نعمت کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔اس کے افعال سے اور اس کے اقوال سے' چنانچہ اس کے اعمال و اقوال ہی اس کے اس جرم پر گواہ ہوتے ہیں۔گویا آفتاب آمد دلیل آفتاب' وہ اپنے اوپر خود گواہ بن جاتا ہے' اور قیامت میں بھی ایسا ہی ہو گا۔

وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ (۱۰۰: ۷) "وہ خود اس پر گواہ ہے"۔اور ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ سچائی کی شہادت خود اپنے خلاف دے گا۔جس میں کوئی شک اور نزاع نہیں۔

وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (۱۰۰: ۸) "اور یہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے"۔یہ اپنی جان اور اپنے مفاد کو بہت ہی محبوب رکھتا ہے۔اس لیے اسے دولت کے ساتھ بہت محبت ہے' دولت کو یہاں "خیر" سے تعبیر کیا گیا ہے' کیونکہ انسان سمجھتا ہے کہ اس کی بھلائی مال و متاع اور اقتدار و حکومت میں ہے جو دنیا کے ساز و سامان ہیں۔

یہ ہے انسان کی فطرت' یہ ہے اس کا مزاج اور یہ تب بدل سکتا ہے جب اس کے مزاج اور اس کی نفسیات میں ایمان داخل ہو جائے۔ایمان کی وجہ سے اس کے تصورات' اس کی قدریں اور اس کے پیمانے ہی بدل جاتے ہیں۔اس کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔جب اس کی نفسیات میں ایمان داخل ہوتا ہے تو پھر انکار اور ناشکری اللہ کے فضل کے اعتراف اور شکر میں بدل جاتی ہے۔جبکہ بخل اور دولت کی محبت' ایثار اور محبت سے بدل جاتی ہے۔یہ ایمان انسان کو ایسی قدریں عطا کرتا ہے جن کے لیے انسان حرص' لالچ' مناقصت اور جدوجہد کرتا ہے۔اور یہ قدریں مال و دولت اور اقتدار اور حکومت سے زیادہ بلند ہوتی ہیں' اور وہ تمام دنیاوی اور حیوانی قدروں سے برتر ہوتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان ایمان کے بغیر نہایت ہی چھوٹا اور حقیر ہوتا ہے' جس کی امیدیں حقیر' جس کی ترجیحات حقیر اور جس کے اہداف حقیر ہوتے ہیں اگرچہ بظاہر وہ بہت عظیم مقاصد نظر آئیں۔جوں جوں انسان کا حرص اور اس کی طمع بڑھتی ہے اور جوں جوں اس کا لالچ شدید ہوتا ہے' اس کے مقاصد بلند ہوتے ہیں' وہ زمینی قدروں کے دلدل میں گرتا جاتا ہے۔اس کی تمام سرگرمیاں اس عمر کے لیے ہوتی ہیں۔وہ اپنی ذات کے اندر محدود اور قید ہو جاتا ہے اور اس قید سے اسے رہائی صرف اس صورت میں نصیب ہو سکتی ہے جب وہ اس دنیا سے ایک بڑی دنیا کے ساتھ مربوط ہو جائے۔

جو اس دنیا سے بہت بلند اور دور ہے' جو اس کی ذاتی محدود دنیا سے بہت وسیع ہے ۔وہ ایسی دنیا ہے جو اللہ ازلی کی تخلیق ہے' جس میں تمام امور اللہ ازلی و ابدی کی طرف لوٹتے ہیں ۔اور جس میں اس محدود دنیا کی سرحدیں ایک وسیع اور لازوال دنیا سے جا ملتی ہیں ۔

چنانچہ سورت کی آخری جھلک اسی کے بارے میں ہے' تاکہ انکار اور ناشکری کا علاج ہو سکے' تاکہ خود غرضی اور مفاد پرستی کی بیماری کا علاج کیا جا سکے تاکہ نفس پرستی کے قلعے کو توڑ کر حقیقی انسان کو اس سے رہائی دلائی جا سکے ۔چنانچہ حشر و نشر کے منظر کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ انسان اس دنیا پرستی اور خود غرضی کو' مارے خوف کے بھول جائے اور خواب خرگوش سے بیدار ہو کر چوکنا ہو جائے ۔

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۝ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۝

"تو کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ (مدفون) ہے اسے نکال لیا جائے' اور سینوں میں جو کچھ (مخفی) ہے اسے بر آمد کر کے اس کی جانچ پڑتال کی جائے گی" ۔

یہ ایک شدید اور موثر منظر ہے ۔قبروں سے انسانوں کا نکالا جانا' اس عمل کے لیے "بعثرہ" کا شدید لفظ لایا گیا ہے اور پھر اس منظر میں ان رازوں کو کھینچ کھینچ کر باہر نکالا جا رہا ہے جن کو نفوس انسانی نے دبائے اور چھپائے رکھا تھا ۔حصلت کا لفظ اس کے لیے استعمال ہوا ہے کہ گویا سرکاری کارندے زبردستی حاصل کر رہے ہیں ۔سرکاری تحصیل دار پہنچے ہوتے ہیں اور نہایت شدید پکڑ دھکڑ کا منظر ہے ۔

کیا انسان نہیں جانتا کہ اسے اس قسم کے منظر سے گزرنا ہے ۔اسے کچھ یاد ہے ان حقائق کے بارے میں' یہ حقائق تو ہر انسان کی فطرت میں ہیں ۔اگر اسے علم ہے اور یاد ہے تو بس اس کی اصلاح کے لیے تو یہی کافی ہے ۔اس علم کا جواب نہیں دیا جاتا کہ اگر وہ جانتا تو کیا ہوتا؟ تم خود ہی سوچ لو کہ کیا ہوتا ۔بہت کچھ ہو جاتا ۔اگر انسان اس بات کو جانتا' بہت بڑے بڑے نتائج بر آمد ہو جاتے' مجرد اس علم سے ۔یہ سب حرکات اور یہ جھلکیاں ایک آخری سکون و قرار پر ختم ہوتی ہیں جس تک پہنچ کر ہر حرکت اور ہر بات اپنے ٹھکانے تک پہنچ جاتی ہے ۔ ۱

اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۝ ۱۱ ع ۲۵

"یقیناً ان کا رب اس روز ان سے خوب باخبر ہو گا" ۔سب لوگ رب کی طرف لوٹنے والے ہیں اور اس دن ان کے امور' ان کے رازوں اور ان کے حالات سے اللہ نہایت ہی اچھی طرح خبردار ہو گا ۔اس دن کی قید نہیں ہے' اللہ تو ہر وقت اور ہر دن ان کے حالات سے خبردار ہے ۔لیکن یہاں "یومئذ" کا لفظ نہایت موثر ہے ۔اور اس کے آثار انسان کو اس دن کے بارے میں چوکنا کر دیتے ہیں ۔یہ کہ اللہ اس دن خبردار ہو گا یعنی کوئی سزا سے نہ بچ سکے گا ۔حساب و کتاب نہایت علم و خبرداری پر مبنی ہو گا ۔یہی ضمنی مفہوم ہی یہاں اہمیت رکھتا ہے ۔غرض یہ پوری سورت ایک ہی مسلسل منظر ہے ۔ایک خوفناک و ہیبت ناک منظر' معانی' الفاظ اور انداز بیان سب کچھ بدل جاتا ہے اور یہ منظر اختتام پذیر ہوتا ہے اور یہ قرآن کے معجز انداز کلام کا ایک مخصوص پہلو ہے ۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۂ القارعة ـ ۱۰۱

۱-- تا-- ۱۱

سورۂ القارعة ایک نظر میں

القارعہ کے معنی ہیں کھٹکھٹانے والی یعنی قیامت ' الطامہ ، الصاخہ ، الحاقہ ، الغاشیہ سب قیامت کے صفاتی معنی ہیں ۔ القارعہ قیامت کو اس لیے کہا گیا کہ یہ اپنی ہولناکیوں سے انسانی قلوب کو جھنجھوڑ دے گی اور خوفزدہ کر دے گی ۔

یہ پوری سورت ایک ہی خوفناک منظر پر مشتمل ہے ۔ اس کا مفہوم ' اس کے واقعات اور اس کا انجام سب کے سب کھٹکھٹانے والے ہیں ۔ یہ قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر ہے ۔ اس منظر میں انسان اپنی کثرت کے باوجود نہایت ہی چھوٹے اور حقیر نظر آتے ہیں ۔ ان کو اس میں ۔

كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ (۱۰۱ : ٤) بکھرے ہوئے پروانوں سے تشبیہ دی گئی ہے ۔ یہ اس طرح اڑتے ہیں ' اس طرح بکھرے پڑے ہیں اور سب کے سب موت کی آغوش میں چلے گئے ہیں جس طرح پروانے اڑ اڑ کر چراغ پر مرتے اور جلتے ہیں اور پھر ادھر ادھر بکھرے پڑے ہوتے ہیں ۔ اور اپنے اوپر کوئی قابو نہیں رکھتے ۔ نہ ان کے نزدیک اس ہلاکت کا کوئی مقصد ہے ' اور نہ وہ کوئی مقصد اپنے پیش نظر رکھتے ہیں اور نہایت ہی مضبوط اور اونچے پہاڑ اس طرح ہلکے اور اڑتے نظر آتے ہیں جس طرح دھنی ہوئی اون ۔ جسے ہوا کے جھونکے ادھر سے ادھر اڑاتے پھرتے ہیں ' یہاں تک کہ ایک سانس بھی ان کو اڑا لیتی ہے ۔ معانی کی جو تصویر اس فریم میں سجائی گئی ہے ۔ اسے القارعہ کا نام دینا نہایت ہی موزوں ہے ۔ یہ لفظ اپنی سخت آواز ' اپنے حروف کی سختی کی وجہ سے پہاڑوں اور انسانی دلوں کے کھٹکھٹانے کے مفہوم کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے اور انسانی قلب و شعور پر اس کے نہایت ہی اچھے اثرات پڑتے ہیں اور انسان آگے حساب و کتاب کے منظر کو دیکھنے کے لیے تیار ہوتا ہے ۔

---ooo---

درس نمبر ۱۰۳ تشریح آیات

۱-- تا-- ۱۱

اَلْقَارِعَةُ ۝۱ مَا الْقَارِعَةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝۳

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"عظیم حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے"۔ بات کا آغاز ایک منفرد لفظ سے ہوتا ہے القارعہ۔ گویا یہ ایک گولہ ہے جو آکر گرتا ہے اس کی کوئی صفت یا کوئی خبر سیاق کلام میں نہیں ہے۔ یہ اس لیے تاکہ یہ لفظ اپنی آواز' اپنے اثر اور اپنی شدت سے فضا میں ایک گونج پیدا کر دے' جس کا ایک طویل اشارہ ہے۔ اس کے فوراً بعد پھر ایک سوال آتا ہے:

مَا الْقَارِعَةُ (۱۰۱: ۲) "کیا ہے وہ کھٹکھٹانے والی؟" گویا وہ ایک نامعلوم' پوشیدہ اور خوفناک بات ہے جو کئی سوالات کو جنم دیتی ہے۔ اس کے بعد پھر ایک سوال کے ذریعہ پہلے سوال کا جواب دیا جاتا ہے کہ تم نہیں جانتے کہ وہ کیا ہے؟

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ (۱۰۱: ۳) "تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟" یہ اس قدر عظیم حادثہ ہو گا کہ تمہارے قیاس و ادراک کے دائرہ سے باہر ہے۔ تمہارا تصور اسے نہیں چھو سکتا۔

اب اس عظیم حادثہ کے کچھ واقعات بتا کر اس کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے۔ اس کی تعریف اور حقیقت بیان نہیں کی جاتی۔ کیونکہ اس کی حقیقت کا ادراک ممکن ہی نہیں ہے جیسا کہ پہلے کہہ دیا گیا اور واقعات یہ ہیں:

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝۴ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝۵

"وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون کی طرح ہوں گے"۔

یہ تو تھا اس کھٹکھٹانے والی اور عظیم حادثے کا پہلا منظر۔ اس کو دیکھتے ہی دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اڑنے لگتا ہے' انسان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور وہ یوں محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس دنیا کی ہر وہ چیز جس کا سہارا وہ لے سکتا تھا' اڑی

اڑی سی جارہی ہے ۔ وہ ہوا میں اس طرح اڑتی ہے جس طرح ذرے اڑ رہے ہوتے ہیں اور اچانک آخری اور مکمل خاتمہ سامنے آجاتا ہے ۔

فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ﴿٦﴾ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿٧﴾ وَأَمَّا
مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ﴿٨﴾ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ﴿٩﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَهْ ﴿١٠﴾ نَارٌ ۱
حَامِيَةٌ ﴿١١﴾ ۱۱ع
۲۶

’’پھر جس کے پلڑے بھاری ہوں گے ‘ وہ دل پسند عیش میں ہو گا ‘ اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے اس کی جائے قرار گہری کھائی ہوگی اور تمہیں کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے؟ بھڑکتی ہوئی آگ‘‘۔ ترازو کے پلڑوں کے بھاری ہونے اور خفیف ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ پیمانے جن کا اللہ کے ہاں اعتبار ہے اور وہ پیمانے جن کا اللہ کے ہاں کوئی وزن نہیں ہے ‘ یہی بات قرآن کریم کے مجموعی انداز بیان سے معلوم ہوتی ہے ۔ واللہ اعلم!

رہے وہ عقلی اور لفظی مباحث جو ان امور کے بارے میں مفسرین و متکلمین کرتے ہیں ۔ یہ قرآن کریم کے ساتھ ناانصافی ہے ۔ یہ مباحث وہی لوگ کرتے ہیں جو قرآن کریم کی حقیقی ترجیحات اور اہتمامات سے واقف نہیں ہوتے ۔

فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ (۱۰۱ : ۶) ’’پھر جس کی قدریں اہم ہوں گی‘‘ اور اللہ کے ہاں وہ درست ہوں گی ۔

فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ (۱۰۱ : ۷) ’’وہ دل پسند عیش میں ہو گا‘‘۔ اور اس عیش کی تفصیلات مجمل چھوڑ دی گئی ہیں ۔ یعنی ایسا عیش ہو گا جس پر وہ راضی ہو گا ‘ بہترین نعمت یہ ہے کہ کسی حالت پر انسان راضی ہو ۔

فَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ (۱۰۱ : ۸) ’’جس کے پیمانے ہلکے ہوئے‘‘ ۔ اللہ کے اعتبار اور معیار کے مطابق ۔

فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ (۱۰۱ : ۹) ’’تو اس کی ماں گہری کھائی ہے‘‘ ۔ ماں دراصل بچے کی جائے پناہ ہوتی ہے ‘ تو ایسے لوگوں کی جائے پناہ جہنم کی گہری کھائی ہوگی اس لیے یہ ان کی ماں ہوئی ۔ کیا ہی خوب انداز تعبیر ہے جو موقع و مقام کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے ۔ یہاں عذاب کو مجمل رکھا گیا ہے تاکہ آیت مابعد میں اس کی وضاحت ایسے انداز میں کی جائے جو بہت ہی موثر ہو ۔

وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَهْ (۱۰۱ : ۱۰) ’’اور آپ کو کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے‘‘ ۔ یہ قرآن کریم کا معروف انداز بیان ہے کہ کسی چیز کو ہولناک بنانے کے لیے یہ کہہ دینا کہ تمہیں کیا معلوم کہ وہ کیا ہے؟

اور پھر اس کے بعد ایک جواب آتا ہے اور یہ آخری نچ ہوتا ہے ۔

نَارٌ حَامِيَةٌ (۱۰۱ : ۱۱) ’’یہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے‘‘ ۔ اور جن لوگوں کے پیمانے ہلکے اور ناقابل اعتبار ہوئے ‘ یہ گرم آگ ان کی ماں ہوگی ۔ اس ماں کی جھولی میں وہ آرام کریں گے اور وہاں آرام و راحت پائیں گے یا تم سمجھ گئے کہ اس ماں کے ہاں وہ کیا آرام پائیں گے جو گہری کھائی ہے اور جس کے اندر گرم آگ ہے ۔ یہ اچانک طنزیہ انداز اس قدر حقیقی ہے اور اس قدر تلخ ہے جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا ۔

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۂ التکاثر ۔ ۱۰۲

۱--- تا --- ۸

درس نمبر۳۰۲ تشریح آیات

۱-- تا-- ۸

اس سورت کی چوٹ نہایت جلیل القدر' خوفناک اور گہرے اثرات کی حامل ہے۔ اس طرح جس طرح کسی ایسے شخص کی آواز ہوتی ہے جو لوگوں کو خطرے سے آگاہ کرتا ہے اور اونچی جگہ پر کھڑا ہے۔ اور اپنی پوری قوت کے ساتھ چیخ رہا ہے اور وہ ایسے لوگوں کو خبردار کر رہا ہے جو سوئے ہوئے ہیں' غافل ہی نہیں بلکہ مدہوش ہیں اور گویا گہری نیند میں ہیں اور بغیر دیکھے آگے بڑھ رہے ہیں اور ایک گہری کھائی میں گرنے ہی والے ہیں۔ ان کی آنکھیں بند ہیں' ان کے حواس معطل ہیں' اس لیے یہ خبردار کرنے والا اپنی پوری قوت سے چیلنج کر رہا ہے۔

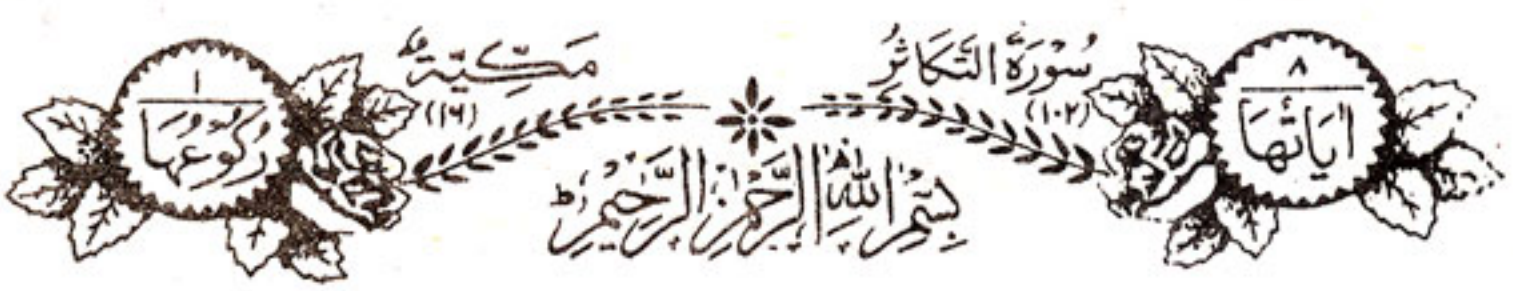

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴿۲﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو"۔

اے حالت مدہوشی میں سرپٹ دوڑنے والو' اے لاپرواہی کی حالت میں مال اور اولاد کی کثرت اور دنیا کے سازوسامان کی بہتات کے لیے جدوجہد کرنے والو' تم تو ان سب چیزوں کو اسی جہاں میں چھوڑ کر جانے والے ہو' اے دنیا کی مشغولیتوں میں دھوکہ کھانے والو' اے مال و اولاد کو چھوڑ کر جانے والو' ایک ایسے چھوٹے سے گڑھے' قبر میں جانے والو' قبر میں تو نہ مال ہو گا' نہ اولاد ہو گی اور نہ وہاں کوئی فخر ہو گا اور اظہار برتری ہو گا' جاگو' اور دیکھو' غور کرو۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (۱) حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۲:۱۰۲) "تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو"۔ لیکن قبر کی سیر کے بعد وہاں تمہارے لیے ایک خوفناک منظر ہے' نہایت سخت اور زوردار انداز میں ان

کے دلوں کو یوں کھڑ کھڑایا جاتا ہے ۔

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۳ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۴

"ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ پھر (سن لو کہ) ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا"۔ ان خوفناک الفاظ کو مکرر کہا جاتا ہے اور اس تکرار کے بعد جو بھاری بات آتی ہے اس کی وجہ سے یہ تاکید نہایت گہری اور خوفناک ہو جاتی ہے اور یہ لوگ اس ہولناک امر کی حقیقت کو نہیں جانتے کیونکہ یہ مدہوشی میں ہیں اور رات دن دولت جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝۵

"ہرگز نہیں، اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اس روش کے انجام کو) جانتے ہوتے (تو تمہارا یہ طرز عمل نہ ہوتا)"۔

اب اس خوفناک حقیقت کو بیان کیا جاتا ہے۔

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝۶

"تم دوزخ دیکھ کر رہو گے"۔ اس کے بعد اس حقیقت کی تاکید کی جاتی تاکہ دلوں پر اس کا خوف طاری ہو۔

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝۷

"پھر (سن لو کہ) تم بالکل یقین کے ساتھ اسے دیکھ لو گے"۔ اور اب آخری ضرب ایسی سخت لگائی جاتی ہے کہ ایک غافل سے غافل انسان بھی بیدار ہو کر رہ جاتا ہے، چوکنا ہو جاتا ہے اور جو منہ کے رخ سرپٹ دوڑ رہا ہے وہ بھی ذرا رک کر اس طرف توجہ کرتا ہے اور بڑے سے بڑے مالدار کا عیش بھی مکدر ہو جاتا ہے، وہ کانپنے لگتا ہے اور اس کے دل پر ان نعمتوں کے حوالے سے خوف طاری ہو جاتا ہے۔

۱

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝۸　　ع ۸

۲۷　"پھر ضرور اس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی"۔

تم سے پوچھا جائے گا کہ یہ نعمتیں تم نے کہاں سے حاصل کیں۔ کہاں ان کو خرچ کیا۔ کیا اللہ کی اطاعت کر کے حاصل کیا اور اللہ کی اطاعت میں خرچ کیا یا اللہ کی معصیت کر کے حاصل کیا اور معصیت میں خرچ کیا۔ حلال راستہ سے کمایا اور حلال راہ میں خرچ کیا یا حرام راستہ سے کمایا اور حرام میں خرچ کیا۔ کیا تم نے ان نعمتوں کا شکر ادا کیا؟ کیا ان کا حق ادا کیا۔ کیا اس میں دوسروں کو شریک کیا یا خود ہی استعمال کرتے رہے۔

یہ سوالات لازماً تم سے ہوں گے کہ یہ دولت کس طرح اکٹھی کی اور کس طرح تم نے اس پر تفاخر کیا۔ یہ دولت اور

یہ انعامات تمہیں اپنی مدہوشی اور غفلت کی وجہ سے ہلکی نظر آتی ہیں۔ اور کھیل نظر آتی ہیں لیکن ان کے پیچھے تو ایک بھاری زمہ داری ہے اور ایک سخت جوابدہی ہے۔

یہ سورت 'نہایت ہی مختصر سورت اپنی تفسیر آپ ہے۔ یہ انسانی احساس پر چھا جاتی ہے' اسے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور انسانی قلب و نظر اس کی گرفت میں بوجھل نظر آتے ہیں۔ انسان یکدم دنیا کی حقیقت پاکر' اس کی حقیر لذتوں اور کم قیمت ترجیحات کو چھوڑ کر فکر آخرت میں مشغول ہو جاتا ہے جبکہ عام لوگ جن کے دل ان حقائق اور اثرات سے فارغ ہوتے ہیں وہ ان حقیر چیزوں کے لیے مرمٹ رہے ہوتے ہیں۔

یہ سورت اس دنیا کو اس طرح پیش کرتی ہے جس طرح ایک طویل فلم میں ایک سیکنڈ کی ایک جھلک۔

اَلْهٰکُمُ التَّکَاثُرُ (۱) حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲ : ۲) "تم کو تکاثر کی دھن نے قبرستان پہنچایا"۔ ان چند الفاظ میں پوری دنیاوی زندگی کی جھلک دکھاکر اسے لپیٹ لیا جاتا ہے۔ پھر دائمی اور حیات جاوداں کی فلم چلتی ہے۔ طویل زمانے میں اور مجرمین ابد الاباد تک بوجھ اٹھاتے پھریں گے۔ یہ تصور نہایت ہی خوبصورت انداز تعبیر میں دیا جاتا ہے اور اصل حقیقت اور انداز بیان یکساں ہو جاتے ہیں۔

ایک عظیم خوفناک اور گہرے معانی رکھنے والی سورت جو شخص بھی سمجھ کر پڑھے گا' جس کے اثرات زمین سے طوفان کی شکل میں اٹھ کر فضاؤں میں جاکر دور بلند مطالع پر نمودار ہوتے ہیں' جس کے معانی نہایت ٹھوس ہیں اور دل و دماغ کے سمندر میں نہایت ہی گہرائیوں میں جاکر قرار پکڑتے ہیں تو اس کا دل بوجھل ہو جاتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کرہ ارض پر زندگی کی ایک جھلک اور چمک' اپنے نتائج و اثرات کے لحاظ سے کس قدر طویل ہے۔ تو ہر باشعور شخص اخروی زندگی کی طویل تیاری کی راہ پر چل نکلتا ہے۔ اور اس راہ میں پھر وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے حوالے سے بھی حساس ہو جاتا ہے۔

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ العصر - ۱۰۳

۱-- تا -- ۳

درس نمبر ۳۰۳ تشریح آیات

۱-- تا-- ۳

یہ مختصر سورت جو صرف تین آیات پر مشتمل ہے 'مکمل اسلامی نظام پیش کرتی ہے۔ تمام انسانوں کے لیے اسلام یہی نظام چاہتا ہے 'یہ ایمانی تصور حیات کے نمایاں خدوخال کو نہایت اور دقیق شکل میں پیش کرتی ہے۔چند کلمات میں دستور حیات کو قلم بند کر دیا جاتا ہے۔امت مسلمہ کو بتا دیا جاتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے فرائض کیا ہیں اور یہ تمام صرف ایک آیت میں بتا دی گئی ہیں یعنی آیات تین ہیں۔یہ ہے قرآن مجید کا حقیقی اعجاز اور یہ اللہ ہی کی قدرت ہے جو ایسا کلام کر سکی ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ عظیم حقیقت کیا ہے جسے یہ سورت ریکارڈ کرتی ہے اور وہ دستور حیات کیا ہے؟ اور یہ دستور حیات پوری انسانیت کے لیے ہے اور یہ حقیقت تمام زمانوں میں یہی ہے کہ انسان کی کامیابی کا منہاج صرف ایک ہی ہے 'ایک ہی راستہ نجات کا ہے جسے یہاں پیش کر دیا گیا ہے۔صحیح راستے کے نشانات وہی ہیں جو اس سورت نے قلم بند کر دیئے ہیں اور یہ کہ اس کے سوا جس قدر راستے اور طریقے ہیں وہ ٹیڑھے ہیں' تباہی کے ہیں۔فقط ایمان 'عمل صالح' حق کی وصیت اور صبر کی تلقین کی راہ ہی درست راہ ہے۔

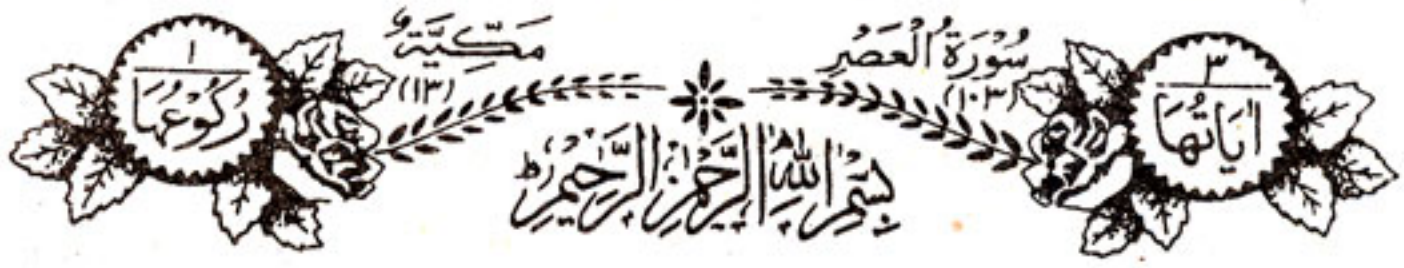

وَالْعَصْرِ ﴿۱﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ۱
تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾ ع ۳
۲۸

"زمانے کی قسم' انسان درحقیقت خسارے میں ہے 'سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے' اور نیک اعمال کرتے رہے 'اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے"۔

سوال یہ ہے کہ ایمان کیا چیز ہے؟---- ہم یہاں ایمان کی فقہی تشریح و تعریف نہیں کرتے۔ہماری بات ایمان کے مزاج 'اس کی قدر و قیمت اور زندگی پر اس کے اثرات تک محدود ہے۔

ایمان دراصل وہ رابطہ ہے جو یہ چھوٹی' محدود' انسانی مخلوق' اس حقیقت کے ساتھ قائم کر لیتی ہے جو ازلی' ابدی

اور باقی رہنے والی ہے اور جو اس کائنات کی اصل ہے اور جس سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ انسانی مخلوق اس حوالے سے اس کائنات کے ساتھ بھی مربوط ہو جاتی ہے کہ دونوں کا خالق ایک ہے' اور پھر یہ حضرت انسان ان قوانین قدرت سے بھی مربوط ہو جاتا ہے جن کے مطابق یہ جہاں چلتا ہے اور انسان ان قوتوں سے بھی مربوط ہو جاتا ہے جو اس کائنات میں عمل پیرا ہیں اور انسان اپنی حقیر اور محدود ذات کے خول سے باہر آکر کائنات کی وسعتوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی محدود قوت کی حدود سے نکل کر' ان "لامحدود قوتوں میں داخل ہو جاتا ہے' جو اس کائنات کے اندر پائی جاتی ہیں اور یہ کائنات انسان کے مقابلے میں اس قدر بڑی ہے کہ اس کی حدود ہی انسان کے علم سے باہر ہیں' پھر انسان اپنی محدود عمر کے دائرے سے نکل کر قیامت اور قیامت کے بعد آنے والے زمانوں کے لامحدود زمانوں میں داخل ہو جاتا ہے۔

مخلوق انسانی کا یہ رابطہ جو قوت' جو وسعت' جو آزادی عطا کرتا ہے' اس کے ساتھ ساتھ' مزید اس کو یہ ذوق بھی عطا کرتا ہے کہ یہ انسان اس پوری کائنات اور اسکے اندر پائے جانے والے حسن و جمال سے بھی لطف اٹھا سکے۔ اور ان مخلوقات کو بھی دیکھ سکے جو اس کی روح کے ساتھ محبت کرنے والی ہے۔ اس رابطے کی وجہ سے زندگی کا مختصر سفر انسان کے لیے ایک تفریحی سفر بن جاتا ہے یا کسی نمائش کی ایک سیر بن جاتی ہے جو اللہ نے اس انسان کے لیے ہر مقام' ہر جگہ اور ہر زمانے میں سجا رکھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت بڑی خوش قسمتی ہے' اعلیٰ درجے کی خوشی اور تفریح ہے اور اس پوری کائنات کے ساتھ ایک دوستی ہے' اور یہ وہ دولت ہے جس کے مقابلے میں کسی اور دولت کی کوئی قیمت نہیں ہے' یہ ایک ایسا نقصان بھی ہے کہ اگر کوئی اس سے محروم ہو جائے تو اس سے بڑا نقصان اور گھاٹا اور کوئی نہیں ہے۔

پھر' ایمان کے بنیادی عناصر بھی وہ ہیں جو انسانیت کے بھی بنیادی عناصر ترکیبی ہیں :

(۱) ایک الٰہ کی بندگی سے انسان کو صرف ایک الٰہ واحد کے علاوہ تمام اطاعتوں' بندگیوں اور پرستشوں سے نجات ملتی ہے۔ یوں انسانوں کے اندر یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ تمام بندے ایک مقام رکھتے ہیں اور باہم مساوی ہیں۔ لہٰذا یہ کوئی معقول رویہ نہیں ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی بندگی کرے یا ایک اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے اپنا سر جھکائے یہاں سے انسان کو آزادی کی حقیقی نعمت نصیب ہوتی ہے! یہ وہ آزادی ہوتی ہے جو انسانی ضمیر سے پھوٹتی ہے اور اس تصور سے پھوٹتی ہے جو بطور حقیقت واقعیہ موجود ہو اور وہ تصور یہ ہے کہ اس کائنات میں صرف ایک حقیقی قوت ہے اور ایک ہی حقیقی معبود ہے۔ چنانچہ اس تصور حیات و تصور کائنات کا طبعی تقاضا یہ ہے کہ انسان آزاد ہو اور اس عقیدے کا منطقی نتیجہ بھی یہی ہے کہ انسان آزاد ہو۔

(۲) انسان میں ربانیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے تمام تصورات' اپنی تمام قدریں اور پیمانے اپنی تمام ترجیحات' اپنا تمام دستور اور قانون اللہ سے اخذ کرتا ہے۔ اور اس کے روابط اللہ سے' اس کائنات سے' اور لوگوں سے' اللہ کے احکام و قوانین کے مطابق قائم ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی سے اس کی ذاتی خواہش اور اس کی ذاتی مصلحتیں معدوم ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ اللہ کی شریعت اور عدل لے لیتا ہے۔ مومن کے شعور میں اس کے نظام زندگی کی قدر و قیمت بلند ہو جاتی ہے' اس کی شخصیت جاہلیت کے تصورات اور اقدار سے بلند ہو جاتی ہے۔ جاہلی ترجیحات ختم ہو جاتی ہیں اور وہ تمام رابطے ختم ہو جاتے ہیں جو زمین اور اس دنیا اور مادی تصورات

پر مبنی ہوں۔ اگرچہ یہ انسان ایک فرد ہو' اس لیے کہ ایک مومن فرد بھی اپنے تصورات' اپنی قدریں اور اپنی ترجیحات براہ راست اللہ سے لیتا ہے' کیونکہ یہ قدریں ہی زیادہ برتر' زیادہ محترم اور زیادہ انتفاع اور قابل لحاظ ہوتی ہیں۔

(۳) ایمان کے نتیجے میں خالق و مخلوق کے تعلق کا بھی تعین ہو جاتا ہے۔ الوہیت اور بندگی' خدائی اور عبودیت کے مقام کا بھی تعین ہو جاتا ہے اور یہ تعلق صاف و ستھرا ہو کر سامنے آتا ہے۔ یہ تعلق جو ایک فانی انسان کو ایک لافانی ذات سے جوڑتا ہے۔ بڑی سادگی اور قابل فہم انداز میں متعین اور واضح ہو جاتا ہے اور اس راہ میں انسان کو کسی واسطے کی ضرورت نہیں رہتی۔ تعین مراتب سے دل میں نور اور روح میں اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ نفس انسانی میں محبت اور اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ تردد' خوف' قلق' اضطراب ختم ہو جاتے ہیں۔ مراتب کی اس وضاحت سے انسان ناحق استکبار بھی نہیں کرتا اور نہ افترا پردازیاں کر کے' من گھڑت تصورات کے بل بوتے پر دوسرے انسانوں پر اپنے لیے برتر مقام کا دعویٰ کرتا ہے۔

(۴) ایمان کی وجہ سے اہل ایمان کو اسلامی نظام حیات پر استقامت نصیب ہوتی ہے۔ پس مومنین کے ہاں بھلائی کوئی عارضی امر نہیں ہوتا نہ کوئی اتفاقی منفرد حادثہ ہوتا ہے' بلکہ اسلامی نظام ایک ایسا واقعہ ہوتا ہے جس کے حقیقی اسباب ہوتے ہیں اور اس کے کچھ حقیقی مقاصد ہوتے ہیں اور اسلامی نظام کو چلانے والے باہم فی اللہ مربوط لوگ ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں اور ایسے لوگوں سے ایک سلیم جماعت تشکیل پاتی ہے' جس کا ایک ہی مقصد ہے' ایک ہی ممتاز جھنڈا ہوتا ہے۔ یہ جماعت ایک تاریخی جماعت ہوتی ہے اور اس کی گزشتہ رفتہ نسلیں بھی آنے والی نسلوں سے مربوط ہوتی ہیں اور آنے والی نسلیں ماضی سے مربوط ہوتی ہیں۔ اور یہ تعلق ایک مضبوط تعلق ہوتا ہے۔

(۵) اس کے نتیجے میں لوگوں کے اندر یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ انسان نہایت مکرم ہے۔ انسان خود اپنی نظروں میں بلند ہو جاتا ہے اور مومن کے ضمیر میں یہ حیا جاگزیں ہوتی ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جس کے نتیجے میں وہ اس مرتبہ سے گر جائے' جس کی طرف اللہ نے اسے اٹھایا ہے اور یہ وہ اعلیٰ و ارفع مقام ہے جس تک پہنچنے کا کوئی انسان تصور نہیں کر سکتا ہے کہ وہ اللہ کے ہاں معزز ہے۔ ہر وہ مذہب یا فلسفیانہ تصور جو انسان کو خود اپنی نظر میں گراتا ہے اور اس کو ایک حقیر مخلوق قرار دیتا ہے جو معتبر انداز میں بعد پیدا ہوئی۔ وہ دراصل انسان اور عالم بالا میں دوری پیدا کرتا ہے اور اس قسم کا مذہب یا فلسفہ انسان کو گراتا ہے اور اس کو گراوٹ کی طرف لے جاتا ہے۔ اگرچہ وہ اسے یہ بات بصراحت نہ کہے۔

چنانچہ ڈارون اور فرائیڈ کے فلسفے اور مارکسی نظام وہ بدترین فلسفے اور نظام تھے جنہوں نے انسان کو بدترین مصیبت میں مبتلا کیا اور اسے انسانیت' فطرت اور انسانی لحاظ سے غلط رخ دیا اور اسے یہ باور کرایا کہ ہر گراوٹ' ہر گندگی اور ہر حقارت دراصل انسانی زندگی کا طبعی اور لازمی حصہ ہے۔ یہ کوئی قابل تعجب بات ہی نہیں ہے' لہٰذا اس میں شرمندہ ہونے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ چنانچہ یہ فلسفے اور یہ نظام دراصل انسانیت کے خلاف ایک گھناؤنا جرم ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان سے نفرت کی جائے۔ (سید کی روح کیا آپ کو یہ اطلاع مل چکی

ہے کہ مارکسیت کے تمام بت اشتراکی دنیا سے گرا دیئے گئے ہیں)۔

(۶) فقط یہ تصور کہ انسان اللہ کے نزدیک ایک مکرم مخلوق ہے' انسانی شعور کو پاک و صاف کر دیتا ہے' پھر یہ تصور کہ اللہ سب کا نگران ہے اور وہ علیم بذات الصدور ہے۔ اس سے بھی انسانی شعور صاف ہوتا ہے' ایک سلیم الفطرت انسان جس کی فطرت کو کارل مارکس' فرائیڈ جیسے لوگوں کی تحریروں نے مسخ نہ کر دیا ہو' وہ اس بات سے حیا کرتا ہے کہ اس جیسا دوسرا انسان اس کے دل کے رازوں اور اس کے برے خیالات پر مطلع ہو۔ اور ایک سچا مومن جو یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے سینے کے تمام رازوں اور دفینوں سے اللہ باخبر ہے۔ وہ اس تصور سے کانپ اٹھتا ہے کہ اس کے دل میں یہ یہ خیالات ہیں۔ اس سے وہ اپنے شعور' احساسات چھوڑتا ہے اور دل کو بھی صاف کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان پیدا ہوتے ہی انسان کے اندر ایک اخلاقی حسن پیدا ہو جاتی ہے وہ ایمان رکھتا ہے کہ ایک الٰہ ہے جو عادل' رحیم کریم اور درگزر کرنے والا ہے۔ حلیم ہے اور محبت کرنے والا ہے' وہ شر کو پسند نہیں کرتا' خیر کو پسند کرتا ہے۔ وہ آنکھوں کے خائن کو بھی جانتا ہے اور دلوں کے بھیدوں کا جاننے والا ہے۔

(۷) پھر یہ تصور کہ انسان کو ارادے کی آزادی دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ کی جانب سے اس کی مکمل نگرانی ہو رہی ہے' اور اس کے نتیجے میں ایک کے اندر احساس اور بیداری پیدا ہو جاتی ہے اور جو سمجھ داری اور تدبر پیدا ہوتا ہے اس کے نتیجہ میں انسان اپنے آپ کو ایک ذمہ دار مخلوق تصور کرتا ہے۔ اور یہ ذمہ داری فقط انفرادی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ ایک اجتماعی ذمہ داری ہے اور ہر بھلائی کا یہ حق ہے کہ اس کے حوالے سے انسان ایک ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرے اور دوسرے انسانوں کے حوالے سے بھی ذمہ داری کا احساس کرے۔ اور یہ ذمہ داری اللہ کے سامنے ہے۔ اس لیے جب ایک مومن کوئی بھی حرکت کرتا ہے تو اس کا احساس و شعور یہی ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملے اور ہر قدم پر اپنے دل میں سوچتا ہے اور قدم اٹھانے سے پہلے ہی نتائج پر غور کر لیتا ہے۔ اس لیے کہ اس تصور کے مطابق انسان ایک ایسی مخلوق ہے جسے اس دنیا میں ایک پوزیشن حاصل ہے۔ اس لیے اس کائنات کے نظام میں وہ ایک ذمہ دار مخلوق ہے۔

(۸) ایمان کے آثار میں سے ایک اہم اثر یہ ہے کہ ایک مومن دنیا کے مفادات پر اس طرح نہیں ٹوٹ پڑتا جس طرح کتے ہڈیوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ایمان کے اشارات و اثرات میں سے ایک اشارہ اور اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اس چیز کو اختیار کرتا ہے جو اللہ کے نزدیک اعلیٰ مقصدیت رکھتی ہو' اور جو "خیر" ہو اور باقی رہنے والی ہو۔

وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳: ۲۶) "مقابلے کرنے والے لوگ مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو بھلائی میں مقابلہ کریں"۔ اللہ کے ہاں جو انعامات ہیں ان میں باہم مقابلہ انسان کو اس دنیا سے بلند کرتا ہے' اس کے قلب کی تطہیر کرتا ہے اور انسان صاف و ستھرا ہو جاتا ہے۔ نیز اس سے ایک مومن کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا کی سرحدوں سے نکل کر آخرت میں بھی سرگرم ہوتا ہے۔ زمین کے ساتھ ساتھ وہ عالم بالا میں بھی جولانی دکھاتا ہے اور یہی بات اس کے اندر یہ قوت پیدا کرتی ہے کہ وہ نتائج کی پرواہ کیے بغیر نیکی کرتا چلا جائے یا نتائج کے بارے میں عجلت

نہ کرے' اس لیے کہ وہ بھلائی اس لیے چاہتا ہے کہ وہ بھلائی ہے اور اس لیے کہ اللہ کی مرضی اسی طرح ہے' یہ اس کی ذمہ داری نہیں ہے کہ اس چھوٹی سی محدود عمر میں بھلائی کے نتائج بھی نکلیں۔ اس لیے کہ جس اللہ کے لیے یہ بھلائی کی جارہی ہے وہ زندہ ہے' وہ مرتا نہیں ہے۔ وہ بھولتا نہیں' وہ کسی چیز سے غافل نہیں۔ پھر یہ دنیا حقیقی دار الجزاء بھی نہیں ہے اور تمام حسابات اس جہاں ہی میں چکنے والے نہیں۔ لہٰذا مومن خیر کو جاری رکھنے کے لیے اس سرچشمے سے مدد لیتا ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ خیر کی تحریک جاری رہتی ہے۔ یہ کوئی وقتی جوش نہیں ہوتا اور نہ کوئی انفرادی واقعہ ہوتا ہے۔ یہی ایمانی جذبہ ہے جس کی وجہ سے' ایک مومن کے اندر اس قدر قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے رشتہ کے مقابلے میں کھڑا ہو جاتا ہے' چاہے یہ شر کسی ایک ڈکٹیٹر اور سرکش کی صورت میں ہو یا جاہلی تصورات و ترجیحات کے دباؤ کی شکل میں ہو' یا انسان کی خواہشات نفس کی صورت میں ہو۔ یہ انفرادی دباؤ کسی فرد پر یوں پڑتا ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ دنیا مختصر ہے' عمر قلیل ہے اور اس میں عیش و عشرت کر لینا چاہئے۔

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

یا یہ اس قدر مختصر ہے کہ اس میں نیکی کے نتائج نہیں نکل سکتے۔ اور ہمارے لیے یہ چانس نظر نہیں آتا کہ ہم باطل پر' حق کا غلبہ دیکھ سکیں۔ اس لیے ایمان اس صورت حالات کا علاج کرتا ہے اور بنیادی علاج۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان ہی زندگی کی اساس ہے' زندگی کی جڑ ہے اور اس سے بھلائی کی تمام شاخیں پھوٹتی ہیں اور اس کا ہر پھل انہی جڑوں سے متعلق ہوتا ہے۔ اور اگر ایمان نہیں ہے تو گویا درخت کی جڑ کٹ گئی ہے اور اس کی تمام شاخیں مرجھا کر خشک ہو جائیں گی اور اگر وہ خشک نہ ہوں تو پھر وہ شیطانی پھل ہو گا اور اس کو دوام اور فروغ حاصل نہ ہو گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان وہ مرکز اور محور ہے جس کے ساتھ اعلیٰ زندگی کی تمام تاریں مربوط ہیں اور اگر ایمان نہیں ہے تو زندگی ایک غیر مربوط حرکت ہے اور ایمان کے بغیر اس زندگی کو کوئی ثبات و قرار نہیں ہے۔ خواہشات اور میلانات جدھر جائیں' کسی کو کھینچ لے جائیں۔

ایمان دراصل ایک نظام ہے اور اس کی وجہ سے تمام متفرق اعمال ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے یہ اعمال باہم ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ ایک سمت میں ہو جاتے ہیں۔ ایک ہی حرکت' ایک ہی محرک' اور ایک ہی ہدف رکھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ہر اس عمل کو کالعدم قرار دیتا ہے جو اس اصل پر مبنی نہ ہو۔ جو اس محور کے گرد نہ گھومتا ہو اور جو سرچشمہ ایمان سے نہ پھوٹتا ہو۔ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام عقائد اس معاملہ میں بالکل اوپن اور صریح ہے۔ سورہ ابراہیم میں ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ (۱۴: ۱۸) "جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ان کے اعمال کی مثال راکھ کی طرح ہے کہ تیز و تند آندھی ایک طوفانی دن میں اسے اڑائے پھرے۔ جو اعمال بھی انہوں نے کئے

تھے ان میں سے وہ کچھ بھی نہ پا سکیں گے"۔ اور سورہ نور میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا (۲۴: ۳۹) "جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے چٹیل میدان میں سراب، پیاسا اسے پانی خیال کرے لیکن جب اس کے پاس پہنچے تو وہاں کچھ نہ پائے"۔ یہ نصوص بصراحت بتا رہی ہیں کہ اعمال جب تک ایمان پر مبنی نہ ہوں، اسلام میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اعمال کی تہہ میں جذبہ یہ ہونا چاہئے کہ خالق کائنات نے یہ حکم دیا ہے اور ان کا مقصد اس کائنات کی تخلیق کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ اور یہ منطقی نتیجہ ہے اس عقیدے کا جو تمام امور کو اللہ کی طرف لوٹاتا ہے اس لیے جس عمل کا تعلق ایمان سے کٹ گیا وہ اپنا مفہوم اور قیمت کھو بیٹھا۔(۱)

ایمان اس بات کی دلیل ہے کہ صاحب ایمان کی فطرت درست ہے اور اس کی شخصیت کی ساخت صحیح سالم ہے اور وہ اس پوری کائنات کے ساتھ ہمقدم ہے۔ اور وہ اپنے ماحول میں پائے جانے والی فطرت کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس لیے وہ اس کائنات میں زندہ رہ رہا ہے۔ اور جس مومن کی شخصیت صحیح سالم ہوتی ہے اس کے اور اس کائنات کے درمیان ایک توافق ہوتا ہے اور یہ توافق اور یہ اتحاد صرف ایمان کا ثمرہ ہوتا ہے کیونکہ اس کائنات میں ایسے دلائل و اشارات موجود ہیں، جو یہ بتاتے ہیں کہ ایک ہی دست قدرت صانع کائنات ہے اس لیے انسان اور کائنات کے درمیان سے یہ توافق ختم ہو جائے تو یہ بات اس پر دلیل ہوگی کہ اس انسان کی شخصیت میں خلل آگیا ہے اور انسان کی وہ صلاحیت ختم ہوگئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اس کائنات سے دلائل و اشارات اخذ کرتا ہے اور اس فساد کی وجہ سے انسان گھاٹے ہی میں رہے گا۔ اگرچہ بظاہر کچھ اعمال نیکی کی چھاپ والے معلوم ہوتے ہیں لیکن ایمان نہ ہونے کی وجہ سے یہ اعمال ناقابل قبول ہوں گے --- غرض مومن کی دنیا وسیع، جامع، لمبی، بلند، خوبصورت اور کامیاب ہوتی ہے۔ جس کے مقابلے میں ان لوگوں کی دنیا جو مومن نہیں ہیں، چھوٹی، حقیر، گری ہوئی، کمزور اور نامراد اور بدبختی پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ اور انجام خسران اور نامرادی ہوتا ہے۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۱۰۳: ۳) "اور نیک اعمال کرتے رہے"۔ نیک عمل درحقیقت ایمان کا قدرتی پھل ہوتا ہے اور جب ایمان کسی قلب میں جاگزیں ہوتا ہے تو عمل صالح اس کی ذاتی حرکت ہوتی ہے (جس طرح

---

(۱) استاد محمد عبدہ، نے آیت فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (۷) وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۹۹: ۸) "جو ذرہ برابر نیکی کرے گا، اسے دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر بدی کرے گا اسے دیکھ لے گا" کے تحت لکھا ہے کہ "بعض علما نے اس پر اجماع لکھا ہے کہ کافر کو اس کی کوئی نیکی قیامت میں نفع نہ دے گی اور اس کے عذاب میں کوئی تخفیف نہ ہوگی، لیکن یہ ایک بے بنیاد بات ہے"۔ ہم سمجھتے ہیں یہ مسئلہ اجماع کا نہیں قرآن کی صریح نصوص کا ہے اور قرآن و سنت اس معاملہ میں بالکل واضح ہیں۔ (سید قطب)

دل متحرک ہوتا ہے) لہٰذا ایمان ایک متحرک اور مثبت حرکت کا نام ہے جونہی وہ کسی شخصیت میں بیٹھتا ہے تو وہ عمل صالح کی شکل میں نمو دار ہوتا ہے ۔ اسلامی نقطہ نظر سے ایمان ایسا ہی ہوتا ہے ۔ اسلام میں کسی ایسے ایمان کا تصور نہیں ہے ۔ جو بجھا ہوا ہو اور جس کے نتیجے میں کوئی حرکت نہ پیدا ہوتی ہو' جو پوشیدہ ہو اور زندہ شکل میں مومن کی ذات سے باہر نہ آتا ہو' اگر اس کے اندر اس قسم کی طبعی حرکت نہ ہو تو وہ ایمان کھوٹا اور مردہ ایمان ہے ' ایمان تو ایک پھول ہے جس کی خوشبو کو روکا نہیں جا سکتا ۔ جہاں پھول ہو گا' اس سے خوشبو پھوٹتی رہے گی ۔ اور اگر کسی شخص میں ایمان کی بو نہیں ہے تو گویا وہ موجود ہی نہیں ہے ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان حرکت 'عمل اور تعمیر کا نام ہے ۔ اور یہ سب امور اللہ کی طرف سے متوجہ ہوتے ہیں ۔ ایمان میں سکیٹر نہیں ہے' نہ وہ منفی چیز ہے ۔ نہ وہ ضمیر کی تہوں میں جاگزیں ہوتا ہے ۔ نہ ایمان نیک خواہشات کا نام ہے ۔ جن کی پشت پر کوئی حرکت نہ ہو' یہ اسلام کا کھلا مزاج ہے جو اسلام کو ایک اعلیٰ تعمیری ذات بنا دیتا ہے اور یہ قوت عملی زندگی کے اندر کی مرکزی قوت محرکہ ہوتی ہے ۔

یہ ہے مفہوم اس بات کا کہ ایمان کو اسلامی نظام حیات کے ساتھ متعلق ہونا چاہئے' اسلامی نظام حیات چونکہ ایک مسلسل حرکت کا نام ہے' جو اس پوری کائنات میں چل رہی ہے' اور یہ حرکت ایک قوت مدبرہ نے پیدا کی ہے اور اس کا ایک ہدف ہے اور انسانیت کی قیادت ایمان کے ہاتھ میں دینے کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسی قیادت وجود میں لائی جائے جو حرکت کا ایک ایسا منہاج وجود میں لائے جو اس پوری کائنات کے مزاج کے مطابق ہو' بالفاظ دیگر ایک اچھی' پاک تعمیری جدوجہد کو برپا کرنا جو اللہ کی طرف سے آئے ہوئے نظام زندگی کے شایان شان ہو ۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳ : ۳) ''جو ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہتے ہیں'' ۔ حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کے اعمال میں سے امت مسلمہ کے خدوخال اچھی طرح واضح ہوتے ہیں ۔ امت مسلمہ ہی کے خطوط پر جماعت مسلمہ بھی قائم ہوتی ہے ۔ اس کا ایک خاص وجود اور شخصیت ہوتی ہے ۔ اس کے افراد کے درمیان ایک امتیازی رابطہ ہوتا ہے ۔ تمام لوگوں کی سمت ایک ہوتی ہے ' اس امت یا جماعت کو اپنے وجود کا شعور بھی ہوتا ہے ' اور اس کے جو فرائض ہیں وہ بھی اس کے پیش نظر ہوتے ہیں ' اور یہ امت یہ جانتی ہے کہ اس نے ایمان اور عمل صالح کے حوالے سے کیا کچھ کرنا ہے ؟ اور وہ جانتی ہے کہ ایمان و عمل صالح کے زاویہ سے اس نے پوری انسانیت کی قیادت بھی کرنی ہے ' لہٰذا ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے امانت کبریٰ کو لے کر اٹھنا ہے ۔

غرض لفظ ''تواصی'' اور اس کے اس مفہوم' اس کے مزاج اور حقیقت ہی میں سے امت مسلمہ کا وجود نمو دار ہوتا ہے ' یا ایک باہم متحد جماعت کا تصور ابھرتا ہے ۔ یعنی ایسی امت جو ممتاز ہو' جو دانش مند ہو' جو اس کرۂ ارض پر سچائی' بھلائی اور عدل و انصاف کے قائم کرنے کی ذمہ دار ہو ۔ یوں امت مسلمہ کی یہ نہایت ہی اعلیٰ اور خوبصورت تصویر ہے ۔ اسلام اس طرح کی امت چاہتا ہے ' ایک ممتاز' قوی' دانش مند اور حق اور بھلائی کی نگرانی کرنے والی امت ۔ جس کے افراد ایک دوسرے کو ہر وقت حق کی نصیحت کرتے ہوں اور صبر کی تلقین کرتے ہوں ۔ باہم محبت اور تعاون سے زندگی بسر کرتے ہوں' ان کے درمیان ایک خصوصی اخوت کارفرما ہو ۔ جسے قرآن مجید وصیت سے تعبیر کرتا ہے ۔

حق کی تلقین اس لیے ضروری ہے کہ حق کو لے کر چلنا ایک دشوار کام ہے' اس دنیا میں بے شمار ایسے عوامل ہیں جو انسان کو سچائی کی راہ سے دور لے جاتے ہیں۔ خواہشات نفسانیہ' مصلحتیں' قومی اور خاندانی تصورات' سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کے مظالم' ظالموں کے ظلم' حد سے گزرنے والوں کے تجاوز اور تعدیاں وغیرہ۔ ایک دوسرے کو نصیحت کرنے سے دراصل یاد دہانی ہوجاتی ہے۔ انسان کے حوصلے بڑھتے ہیں اور اغراض و مقاصد کے لحاظ سے افراد جماعت کے درمیان اتحاد اور یگانگت پیدا ہوتی ہے۔ اور ذمہ داریاں اٹھانے میں دراصل ایک دوسرے کا بوجھ اٹھایا جاتا ہے۔ نصیحت سے تمام انفرادی رجحانات اکٹھے ہوکر کئی گنا ہوجاتے ہیں اور وہ تمام لوگ جو سچائی کے نگران اور حامی ہوتے ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ حق اور صداقت کی حفاظت کے کام میں میرے ساتھ اور لوگ بھی ہیں۔ جو اس کو نصیحت کرتے ہیں' اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس سے محبت کرتے ہیں' اس کی پشت پر کھڑے ہیں۔ اور یہ کبھی اسے شرمندہ ہونے نہ دیں گے۔ یہ دین ہی دراصل حق ہے اور اس دین کی حفاظت ایک جماعت ہی کر سکتی ہے۔ جو باہم متعارف ہو' باہم کفیل ہو' اور ایک دوسرے کی معاون ہو اور ایک دوسرے کی کمزوریاں پوری کرنے والی ہو۔

اور صبر کی تلقین بھی بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ ایمان و عمل صالح پر گامزن رہنا اور حق و انصاف کی نگرانی کرنا ایک مشکل کام ہے۔ اس میں صبر اور مصابرت اور نفس کے اندر کے عوامل کے خلاف سخت جہاد کی ضرورت ہے اور نفس سے باہر کے عوامل کے خلاف جہاد کی بھی ضرورت ہے اور اس راہ میں آنے والی مشکلات پر صبر و مشقت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح باطل کے استکبار اور فخر پر صبر کرنا' راستے کی طوالت پر صبر کرنا اور کامیابی کی سست روی پر صبر کرنا اور راستے کے نشانات کا ناپید ہونا اور مٹ جانا اور ان پر صبر کرنا۔

صبر کی تلقین سے انسانی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور لوگوں کے اندر ایک اجتماعی احساس پیدا ہوتا ہے کہ ہم سب کا ہدف واحد ہے' رخ ایک طرف ہے' اس طرح اس سے سب کو ایک سہارا ملتا ہے۔ کارکن اس راہ میں کام کرتے ہوئے باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں اور نہایت عزم' ثابت قدمی اور اپنے مقصد پر اصرار کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ نیز اس سے کئی اور اجتماعی صفات بھی پیدا ہوتی ہیں اور یہ کئی اسلامی جماعت کے استحکام کے لیے ضروری ہیں کیونکہ اسلام جماعتی فضا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسلام کا ظہور بھی ایک سوسائٹی کی شکل میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی سوسائٹی ہی نہیں ہے تو اسلام نہ ہو گا اور یہ سراسر خسارہ ہو گا۔

قرآن نے ہمارے لیے جو دستور وضع کیا اور جس کے مطابق کسی سوسائٹی کو ایک کامیاب اور خسران دنیوی اور اخروی سے محفوظ قرار دیا ہے۔ اگر ہم اس دستور کی عینک لگا کر اس وقت دنیا کے حالات کا جائزہ لیں تو ہمارے سامنے دنیا کی یہ خوفناک تصویر آئے گی کہ اس وقت پوری دنیا مکمل خسارے سے دوچار ہے۔ اس خسارے کا زیادہ خوفناک پہلو یہ ہے کہ آخرت سے بھی پہلے ہم محض دنیاوی نقطہ نظر سے بھی سخت خسارے میں پڑ چکے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانیت نے اس بھلائی سے مکمل روگردانی اختیار کر لی ہے' جس کے فیوض و برکات اللہ نے انسانوں کے لیے عام کر دیئے تھے۔ نیز اس دنیا سے وہ اقتدار اعلیٰ ختم ہو چکا ہے جو ایمانی اور اسلامی ہو' جو بھلائی اور حق و انصاف کے اصول پر قائم ہو۔ اس تصویر کا نہایت ہی بھدا پہلو یہ ہے کہ مسلمان یا زیادہ صحیح الفاظ میں وہ لوگ جو اس زمین پر بسنے والے دوسرے انسانوں کے مقابلے میں' اس بھلائی اور خیر سے بہت دور پڑ گئے ہیں' وہ اس نظام زندگی سے بہت دور ہو گئے جو اللہ نے ان کے

لیے پسند فرمایا تھا۔ انہوں نے اس آئین و دستور کو پامال کر دیا جو اللہ نے ان کے لیے تجویز کیا تھا۔ جسے اللہ نے خسارے اور ناکامی سے نجات پانے کا واحد راستہ قرار دیا تھا۔ خصوصاً وہ علاقے جہاں سے اس بھلائی کے جھنڈے سب سے پہلے بلند ہوئے تھے۔ انہوں نے خود ان جھنڈوں کو گرا دیا ہے' جو ان کے لیے اللہ نے بلند کیے تھے۔ یہ تھے ایمان کے جھنڈے۔ اور نہایت بدقسمتی یہ ہے کہ جن علاقوں سے اللہ کے دین کے یہ جھنڈے بلند ہوئے تھے انہوں نے نسلی قومیت کو اپنا لیا ہے حالانکہ اس زمین کی تاریخ شاہد ہے کہ نسلی قومیت کے ذریعہ کبھی بھلائی تک کوئی قوم نہیں پہنچ سکی۔ ان لوگوں نے جس نسلی قومیت (عرب نیشنلزم) کے جھنڈے بلند کر رکھے ہیں۔ یہ قومیت اس کے پاس اسلام سے پہلے بھی تھی' لیکن اس کی وجہ سے نہ اس زمین پر انہوں نے کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام دیا اور نہ آسمان میں ان کا کوئی کارنامہ ریکارڈ ہوا' جب اسلام آیا تو عربوں کے ذریعہ اس نے ایک ایسا جھنڈا بلند کیا جو صرف اللہ کا جھنڈا تھا' اس میں کوئی اور عنصر شریک نہ تھا' یہ اللہ کے نام سے تھا' نام میں بھی کوئی شریک نہ تھا' یہ صرف اللہ کی طرف منسوب تھا' جس میں کوئی اور نسبت نہ تھی' صرف اللہ کا رنگ تھا' کوئی اور رنگ نہ تھا۔ اس جھنڈے کے زیر سایہ عربوں کو عروج نصیب ہوا۔ وہ دنیا کے قائد بن گئے۔ اور ان کی قیادت بھلائی کی قیادت تھی۔ ایک قوی قیادت تھی' دانشمند قیادت تھی اور ہر پہلو سے کامیاب قیادت تھی۔ یہ قیامت عربوں کی تاریخ میں بھی پہلی بار کامیاب ہوئی اور انسانی تاریخ میں بھی اسلامی انقلاب انسانیت کے لیے ایک نمایاں کامیابی تھی۔

مولانا ابو الحسن علی ندوی اپنی مشہور کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کے فصل "اسلامی اقتدار اور مسلمان قائدین" میں فرماتے ہیں :

"مسلمان میدان میں آئے' دنیا کی رہنمائی کی باگ انہوں نے اپنے ہاتھ میں لی اور ان بیمار قوموں کو رہنمائی کے اس منصب سے معزول کیا جس پر وہ قابض ہو گئی تھیں اور جس کو انہوں نے کبھی صحیح طور پر استعمال نہ کیا تھا۔ مسلمانوں نے پوری دنیا کے انسانوں کو اپنے ساتھ لیا اور متوازن اور صحیح رفتار سے اپنی صحیح منزل کی طرف بڑھانا شروع کیا۔ ان میں وہ تمام خصوصیات جمع تھیں' جو ان کو تمام اقوام کی رہنمائی کے منصب جلیل کا اہل ثابت کرتی تھیں اور ان کی نگرانی اور قیادت میں قوموں کی فلاح اور سعادت کی ضمانت دیتی تھیں۔ یہ امتیازی خصوصیات کیا تھیں وہ یہ ہیں :

(۱) ان کے پاس آسمانی کتاب اور خدا کی شریعت تھی' وہ اپنی جانب سے قانون سازی اور شریعت سازی نہ کرتے تھے' اس لیے کہ انسانی قانون سازی جاہلیت' ظلم اور غلطیوں کا سرچشمہ ہوتی ہے اور جب انسان انسانوں کے لیے قانون بناتے ہیں تو ہر روز ان میں رد و بدل اور ترمیم ہوتی رہتی ہے جبکہ آسمانی کتابیں ان غلطیوں سے محفوظ ہوتی ہیں۔ مسلمان اپنے روز مرہ کے معاملات اور سیاست اور سیادت میں اندھا دھند چلنے اور اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے سے محفوظ تھے۔ ان کے پاس وحی الٰہی کی روشنی تھی جس کے سہارے وہ چلتے تھے۔ اور جس سے زندگی کی تمام راہیں اور موڑ ان کے لیے روشن تھے۔ ان کا ہر قدم روشنی میں پڑتا تھا۔ اور ان کو اپنی منزل مقصود صاف نظر آتی تھی۔ سورہ انعام (۱۲۲) میں ہے۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي

الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (٦: ١٢٢) "کیا وہ جو پہلے مردہ تھا' پھر ہم نے اس میں جان ڈالی اور اس کو ایک روشنی عطا فرمائی جس کی مدد سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے' کیا وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہے کہ اندھیرے میں گھرا ہوا ہے' وہاں سے نکل نہیں سکتا۔

ان کے پاس ایک خدائی قانون اور شریعت تھی جس کے مطابق وہ لوگوں کے درمیان فیصلے کرتے تھے۔ وہ حق و انصاف کے علم بردار بنائے گئے تھے اور ان کو سخت سے سخت اشتعال اور برہمی اور عداوت' اور نفرت کی حالت میں بھی یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ سچائی اور انصاف کا دامن نہ چھوڑیں اور یہ نہ ہو کہ وہ حق و انصاف کے معاملے میں انتقام لیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (٥: ٨) "اے ایمان والو' ہر وقت انصاف کے ساتھ گواہی دینے کے لیے تیار رہو' اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں مجبور نہ کر دے کہ تم انصاف کو چھوڑ دو' عدل کرو' یہ بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ کو ان باتوں کا علم ہے جو تم کرتے ہو"۔

(۲) وہ حکومت اور قیادت کے منصب پر مستحکم اخلاقی تربیت اور تہذیب نفس کے بعد فائز ہوئے تھے۔ انہوں نے دنیا کی عام حکمران قوموں اور اہل حکومت کی طرح اپنے تمام اخلاقی عیوب اور نقائص کے ساتھ' پستی سے بلندی کی طرف جست نہیں لگائی تھی' بلکہ ایک طویل عرصہ تک وحی الٰہی ان کی اصلاح و تربیت کرتی رہتی تھی اور سالہا سال وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل نگرانی اور تعلیم میں رہے تھے۔ آپؐ ان کا تزکیہ فرماتے رہے' ان کی مکمل تربیت فرمائی۔ زہد و ورع کی زندگی کا عادی بنایا' عفت و امانت' ایثار و قربانی' خوف خدا کا ان کو خوگر کیا۔ حکومت و مناصب کی حرص و طمع ان کے دل سے بالکل نکال دی۔ آپ کا ارشاد تھا "بخدا ہم کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کو سپرد نہیں کریں گے جس نے فرمائش کی یا جس کو اس کی خواہش ہے"۔ ترفع' سربلندی اور اعزاز کا شوق اور فتنہ و فساد کی خواہش سے ان کے دل بالکل صاف ہو گئے تھے' ان کے کانوں میں' رات دن قرآن مجید کے یہ الفاظ پڑتے تھے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (٢٨: ٨٣) "یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو عطا کریں گے' جو دنیا میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور فساد کے خواہاں نہیں اور اچھا انجام پرہیز گاروں کے لیے ہے"۔

اس لیے وہ حکومت کے عہدوں اور منصبوں پر پروانہ وار نہ گرتے تھے' بلکہ اس کے برعکس وہ ان کو قبول کرنے سے گریز کرتے تھے اور ان کی ذمہ داریوں کو سوچ کر کے وہ لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ ان میں سے

جس کو بھی کسی منصب کی پیش کش کی جاتی وہ پیچھے ہٹتا تھا۔ اور اپنے کو اس بار کا قابل نہ سمجھتا تھا۔ چہ جائیکہ ان میں سے کوئی اپنا نام حکومت کے لیے پیش کرے۔ یا اپنی ذات کے لیے پروپیگنڈا کرے۔ پھر وہ جب کسی ذمہ داری کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے تو اس کو مال غنیمت یا لقمہ تر نہ سمجھتے تھے بلکہ اس کو اپنے ذمہ ایک امانت اور اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھتے تھے۔ اور یقین رکھتے تھے کہ اللہ کے سامنے ان کو حاضر ہونا ہے اور ہر چھوٹی بڑی چیز کا جواب دینا ہے۔ اور وہ یہ آیت ہمیشہ پڑھتے تھے :

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (٤ : ٥٨) "مسلمانو، اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کو پہنچا دو اور جب فیصلہ کرنے لگو تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ کرو"۔ نیز یہ ارشاد۔

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰىكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٦ : ١٦٥) "اور اسی نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے اور تم میں سے بعض کو دوسروں پر درجے دیئے ہیں تا کہ تمہیں آزمائے، ان انعامات میں جو تمہیں دی گئیں۔ بے شک تمہارا پروردگار بڑی سزا دینے والا ہے اور وہی بخشنے والا مہربان ہے۔

(۳) وہ کسی قوم کے خدمت گزار اور کسی نسل اور وطن کے نمائندے نہ تھے، جن کے پیش نظر محض اس قوم اور نسل کی خوشحالی ہو، یا وہ کسی قوم کی برتری اور اسے تمام اقوام پر قیادت و سیادت کا مقام دلانے کے قائل ہوں۔ اور یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ ہماری قوم قیادت کرنے کے لیے ہے اور باقی اقوام صرف محکوم بننے کے لیے ہیں۔ وہ عالم عرب کے حدود سے باہر اس لیے نہ نکلے تھے کہ دنیا پر عرب شہنشاہیت قائم کریں۔ اور اس کے زیر سایہ راحت اور عشرت کی زندگی گزاریں۔ اور اس کے زیر حمایت دوسروں پر فخر و تکبر کریں۔ نہ اس لیے کہ لوگوں کو رومیوں اور ایرانیوں کی غلامی سے نکال کر عربوں کی اور اپنی غلامی میں داخل کرائیں۔ وہ صرف اس لیے نکلے تھے کہ وہ بندگان خدا کو اپنے جیسے تمام لوگوں کی بندگی سے نکال کر صرف اللہ وحدہ لاشریک کی بندگی میں داخل کریں۔ مسلمانوں کے سفیر ربعی ابن عامر نے یزدگرد شاہ ایران کے بھرے دربار میں اس حقیقت کا اعلان کیا۔ انہوں نے کہا اللہ نے ہم کو اس لیے بھیجا ہے کہ لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر ایک اللہ کی بندگی کی طرف اور دنیا کی تنگی سے رہائی دے کر اللہ کی وسعتوں کی طرف، اور مذاہب کے ظلم و ستم سے رہائی دلا کر اسلام کے عدل و انصاف میں لائیں۔ بس دنیا کی تمام قومیں اور تمام انسان ان کی نگاہ میں ایک حیثیت رکھتے تھے۔ اگر فرق تھا تو محض دین کا تھا۔ غرض رسول اللہؐ کے اس ارشاد پر ان کا پورا عمل تھا "سب لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے اور نہ عجمی کو عربی

پر فضیلت ہے' ماسوائے تقویٰ کے"۔

اور سورۂ حجرات کی آیت ۱۳ میں ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۴۹ : ۱۳) "اے لوگو' ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے' اور تمہیں قوم قبیلے میں تقسیم کیا تاکہ تمہارا باہم تعارف ہو' اللہ کے نزدیک تم میں سے مکرم وہی ہے جو زیادہ متقی ہے"۔

حاکم مصر حضرت عمر بن العاص کے بیٹے نے ایک موقعہ پر ایک مصری کو کوڑا مارا اور اپنے باپ دادا پر فخر کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس مصری کو اس سے بدلہ لینے کا حکم دیا۔ اور عمر ابن العاص سے کہا 'کب سے تم نے لوگوں کو غلام بنا لیا حالانکہ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے ہیں"۔

ان فاتحین اور حکمرانوں نے دین و علم و تہذیب کی بخشش میں کبھی بخل اور تنگ دلی سے کام نہیں لیا اور حکومت اور مناصب حکومت کے بارے میں کبھی وطنیت اور رنگ و نسل کا لحاظ نہیں کیا' وہ تو ایک ابر کرم تھے جو تمام عالم پر محیط تھا۔ اور اس کا فیض سب کے لیے عام تھا۔ جو سارے عالم کو سیراب کرتا گیا اور زمین کے ہر حصے نے اس کو دعائیں دیں اور مخلوقات نے اپنی اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق اس سے نفع اٹھایا۔

ان لوگوں کے زیر سایہ اور زیر حکومت دنیا کی تمام قوموں کو بلا اختلاف رنگ و وطن اور دین' علم و تہذیب اور حکومت میں اپنا پورا پورا حصہ لینے اور عربوں کے ساتھ تعمیر نو میں شریک ہونے کا پورا پورا موقعہ ملا۔ بلکہ ان کے بہت سے افراد بہت سی فضیلتوں میں عربوں سے سبقت لے گئے تھے اور ان میں ایسے ائمہ اور فقہا اور محدثین پیدا ہوئے جو خود عربوں کے سر کا تاج اور مسلمانوں کا سرمایہ افتخار تھے۔

(۴) انسان مجموعہ ہے جسم' قلب اور عقل کا۔ انسان حقیقی فلاح و سعادت اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا اور انسانیت کو متوازن ترقی اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان کی یہ تمام قوتیں متناسب طور پر' اس کے مرتبہ کے شایان شان' نشوونما اور پرورش نہ پائیں۔ دنیا میں صالح تمدن کا اس وقت تک وجود نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایسا ہی دینی' اخلاقی' عقلی اور مادی ماحول نہ قائم ہو جائے۔ جس میں انسان کے لیے پوری پوری سہولت سے کمال تک پہنچنا ممکن ہو اور تجربہ نے ثابت کر دیا کہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کسی زندگی کی رہنمائی اور تمدن کی جہاز رانی ان لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہو جو روحانیت اور مادیت دونوں کے قائل ہوں۔ اور دینی اور اخلاقی زندگی کا نمونہ کامل ہوں اور عقل سلیم اور علم صحیح سے متصف ہوں۔ (ص ۱۰۰ تا ۱۶۴)

اور ایک دوسرے. فصل دور خلافت راشدہ کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں :

"چنانچہ ہم کو تاریخ میں خلافت راشدہ کے دور سے زیادہ ان تمام حیثیتوں سے مکمل اور کامیاب دور کا علم نہیں' اس دور میں روحانی' اخلاقی' دینی و علمی' روحانی وسائل و سامان' انسان کامل اور صالح تمدن کے وجود میں لانے میں ایک دوسرے کے مددگار تھے۔ اس حکومت میں' جس کا شمار دنیا کی عظیم ترین حکومتوں میں تھا' ایسی سیاسی و مادی قوت کے

جو تمام معاصر قوتوں سے فائق و برتر تھی ۔ اعلیٰ اخلاقی نمونے اور اعلیٰ معیار کام دیتے تھے ۔ تجارت و صنعت کے ساتھ اخلاق اور فضیلت بھی اپنے پورے عروج پر تھی ۔ فتوحات کی وسعت اور تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاق اور افادیت دونوں کی ترقی بھی جاری تھی ۔ چنانچہ اسلامی حکومت کی غیر معمولی وسعت ' آبادی کی انتہائی افزونی عیش و عشرت کے وسائل و اسباب ترغیبات کے باوجود ' جرائم ' بداخلاقی کے واقعات بہت کم پیش آتے تھے ۔ فرد کا دوسرے فرد کے ساتھ اور فرد و جماعت کا باہمی تعلق حیرت انگیز طریقے پر تھا ۔ یہ ایک معیاری دور تھا جس سے زیادہ ترقی یافتہ دور کا انسان خواب بھی نہیں دیکھ سکا ۔ اور اس سے زیادہ مبارک اور پربہار زمانہ فرض ہی نہیں کیا جا سکتا" ۔ (ص ۱۶۷) یہ تھے اس دور سعید کے بعض خدوخال جس میں انسانیت نے ایک مختصر سے عرصے کے لیے سورۂ عصر کے وضع کردہ اسلامی دستور کے زیر سایہ زندگی بسر کی ۔ اس عرصہ میں لوگوں پر ایسے لوگوں کی ایک ایسی ایمان والی جماعت کی حکومت تھی جس نے ایمان کے جھنڈے اٹھائے تھے اور عمل صالح اس کا پروگرام تھا اور حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین اس کا شعار تھا ۔

یہ ایک ایسا سنہری دور تھا جس کا مقابلہ اس بربادی سے ہرگز نہ کیا جا سکتا ۔ جس سے آج پوری انسانیت دوچار ہے ۔ معرکہ ' خیر و شر میں پوری انسانیت خسارے اور تباہی میں مبتلا ہے ۔ پوری انسانیت نے ' اس عظیم خیر کی طرف سے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں ' جو کبھی عربوں نے پوری انسانیت کے لیے عام کر دی تھی ' اس دور میں جب کہ انہوں نے اسلام کے جھنڈے اٹھا رکھے تھے ۔ اور اس وقت وہ پوری انسانیت کے قائد اور رہنما تھے اور اس کے بعد کے ادوار میں جب انہوں نے یہ جھنڈے پھینک دیئے تو وہ قافلہ انسانیت کے خادم بن گئے جبکہ یہ قافلہ بھی بربادی کی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے اور جاتے جاتے یہ حالت ہو گئی ہے کہ پوری انسانیت نے شیطانی جھنڈے اٹھا لیے اور ان میں سے کوئی جھنڈا انسانی جھنڈا نہیں ہے ۔ پوری انسانیت نے باطل کے جھنڈے اٹھا لیے ' کہیں بھی حق کا کوئی جھنڈا نظر نہیں آتا ۔ پوری انسانیت نے اندھے پن اور گمراہی کے جھنڈے اٹھا لیے ان میں کہیں بھی ہدایت اور نور کا کوئی ایک جھنڈا نظر نہیں آتا ۔ سب جھنڈے خسارے کے ہیں ' کامیابی کا کوئی ایک جھنڈا بھی نظر نہیں آتا ۔ اللہ کا وہ جھنڈا جس کے ذریعہ عرب دنیا پر چھا گئے تھے ۔ آج بھی موجود ہے ۔ یہ جھنڈا آج بھی کسی اٹھانے والے ہاتھ کا منتظر ہے ۔ کسی ایک جماعت یا قوم کی ضرورت ہے جو اس جھنڈے کے نیچے بھلائی ' ہدایت ' صلاح اور فلاح کی راہ پر چلے ۔

یہ ہے ' اس جہاں میں نفع و نقصان کی کہانی ۔ یہ دنیاوی عظمت اپنی جگہ بہت بڑی کامیابی ہے لیکن اگر ہم اس کا تقابل اخروی کامیابی کے ساتھ کریں تو یہ بہت ہی حقیر ہے ۔ اصل نفع و نقصان آخرت کا ہے ۔ وہاں ہی حقیقی نفع و نقصان ہے ۔ اس لیے کہ وہ طویل زندگی ہے ۔ اور ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی ہے ۔ اور ہمیشہ رہنے والا جہاں ہے ۔ اصل منافع اور اصل خسارہ وہاں ہے ۔ جنت ' اللہ کی رضامندی کا منافع یا جہنم ' اللہ کی ناراضگی کا خسارہ ۔ آخرت میں جہاں انسان اپنے اعلیٰ ترین ترقی و کمال تک پہنچ سکا ہو گا یا اس قدر گر چکا ہو گا کہ اپنی انسانیت میں کھو بیٹھا ہو گا ۔ وہ ایک پتھر کی قدر و قیمت تک گر جائے گا اور راحت و آرام میں پتھر سے بھی کم ہو گا ۔

يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا (۷۸: ۴۰)

"جس دن ہر شخص وہ کچھ دیکھ لے گا جو اس نے کما کر آگے بھیجا اور کافر کہے گا کاش کہ میں مٹی ہو جاتا" ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سورت ایک فیصلہ کن اور دو ٹوک راہ حق بتاتی ہے' یہ بتاتی ہے کہ تمام راہیں خسارے کی ہیں ماسوائے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

(۱۰۳ : ۳) "ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے اور حق کی وصیت کی اور صبر کی وصیت کی"۔ اور یہ ایک ہی راہ ہے اس میں تعدد نہیں ہے' یہ ایمان اور عمل صالح کی راہ ہے۔ ایک اسلامی جماعت کے قیام کی راہ ہے۔ ایک ایسی جماعت' کی راہ جو حق کی نصیحت کرتی ہو اور جو خیر کی تلقین کرتی ہو' جو سچائی کی سپاہ ہو اور صبر اس کی تنخواہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ راستہ ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی رسول اللہ کے دو ساتھی ایک دوسرے سے ملتے تو تب جدا ہوتے جب وہ سورہ عصر پڑھ لیتے۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے کو سلام کہہ کر چلے جاتے۔ دراصل ان کا باہم معاہدہ ہوتا تھا کہ اس انقلابی دستور پر چلیں گے وہ باہم معاہدہ کر لیتے تھے کہ ایمانی صلاح کی راہ پر گامزن رہیں گے۔ حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہیں گے۔ اور اس کا عہد کرتے تھے کہ وہ اس دستور کے چوکیدار رہیں گے اور اس جماعت کے فرد رہیں گے جو اس دستور پر گامزن ہوگی۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ -- ۳۰

سورۃ الھمزۃ ۔ ۱۰۴

۱-- تا-- ۹

درس نمبر ۳۰۴ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۹

آیاتها ۹ سُورَةُ الْهُمَزَةِ (۱۰۴) مَكِّيَّةٌ (۳۲) رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ۙ﴿۲﴾ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ
اَخْلَدَهٗ ۚ﴿۳﴾ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۫ۖ﴿۴﴾ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ؕ﴿۵﴾ نَارُ
اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ﴿۶﴾ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ﴿۷﴾ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ﴿۸﴾ ۱
فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۧ﴿۹﴾ ع۹
۲۹

"تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے، جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔ ہرگز نہیں، وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ چکنا چور کر دینے والی جگہ؟ اللہ کی آگ، خوب بھڑکائی ہوئی، جو دلوں تک پہنچے گی۔ وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی (اس حالت میں کہ وہ) اونچے اونچے ستونوں میں (گھرے ہوئے ہوں گے)"۔

یہ سورت بھی قرآن کے البم کی تصاویر میں سے ایک تصویر ہے۔ اور یہ تصویر دعوت اسلامی کے ابتدائی ایام کی حقیقی تصویر ہے لیکن یہ ایک ایسی تصویر ہے کہ ایسی تصاویر ہر سوسائٹی میں ملتی ہیں۔ یہ ایک گھٹیا اور چھوٹے درجے کے انسان کی تصویر ہے، ایک ایسے شخص کی جسے دولت دی گئی ہے اور دولت کی پرستش اور محبت اس پر چھا جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا چھوٹا ظرف اب طاقت نہیں رکھتا کہ اسے سمیٹ لے یا ہضم کر لے۔ ایسا شخص سوچنے لگتا ہے کہ دنیا میں تو "مال" اور "دولت" ہی اعلیٰ قدر ہے۔ یہ ایک ایسی قدر و قیمت ہے جس کے مقابلے میں تمام اقدار ہلکی ہیں، چاہے وہ ایمان کی قدریں، معانی کی قدریں ہوں، حقائق و عقائد کی قدریں ہوں اور وہ سوچتا ہے کہ چونکہ اسے مال دے دیا گیا ہے۔ اس

لیے اسے تمام اعزازات دے دیئے گئے ہیں اور وہ لوگوں کی عزتوں اور حقوق کا مالک ہے۔

پھر یہ دولت مند یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ دولت کا دیوتا علی کل شئی قدیر ہے' وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور کوئی ایسا کام نہیں ہے جو دولت کا دیوتا نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ وہ سمجھتا ہے کہ دولت کے ذریعہ سے موت کو بھی ٹالا جا سکتا ہے۔ زندگی کو دائمی بنایا جا سکتا ہے' اللہ کے نظام قضا و قدر و نظام جزاء و سزا کو بدلا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی حشر و نشر ہوا اور حساب و کتاب ہو بھی گیا تو وہاں بھی مال لگ سکتا ہے۔

چنانچہ ایسا شخص رات دن مال کے حصول کی جدوجہد کرتا ہے۔ دولت کو گنتا رہتا ہے اور گنتے گنتے مزے لیتا ہے۔ پھر اس مال کی وجہ سے اس کی فسق و فجور کی آگ بھڑکتی ہے۔ وہ لوگوں کے حقوق پامال کرتا ہے' ان کی آزادی سلب کرتا ہے اور ان کی عزت و شرافت کو پامال کرتا ہے۔ وہ لوگوں کو طعنے دیتا ہے اور ان کی برائیاں کرتا ہے۔ اپنی زبان سے ان کی عیب جوئیاں کرتا ہے اور اپنے رویے اور اپنی حرکات کے ذریعہ ان کے عیب نکالتا ہے۔ کبھی ان کی حرکات کی نقل اتارتا ہے' کبھی ان کی آواز کی نقل اتارتا ہے۔ کبھی ان کی صفات کو حقارت سے دیکھتا ہے' منہ زبانی یا اشارات کے ساتھ' کبھی ایک حقارت آمیز نظر سے اور کبھی گری ہوئی حرکات سے۔

یہ تصویر نفس انسانی کی تصاویر میں سے نہایت ہی حقیر اور گری ہوئی تصویر ہے۔ اس میں ایمان اور مروت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اسلام ایسی گری ہوئی تصاویر کو سخت ناپسند کرتا ہے' کیونکہ اسلام ایک بلند اخلاقی معیار رکھتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے بار بار مزاح' طعنہ زنی اور عیب جوئی سے لوگوں کو منع کیا ہے۔ البتہ اس سورت میں ان چیزوں کو نہایت ہی مکروہ شکل میں پیش کیا ہے اور ایسے گرے ہوئے اخلاق کا مظاہرہ کرنے والوں کو سخت دھمکی بھی دی ہے۔ اس سورت میں یہ اشارہ بھی ہے کہ دعوت اسلامی کے ابتدائی دنوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کی جماعت کو ایسے ہی حالات سے گزرنا پڑا تھا' چنانچہ بعض مالداروں کی ان حرکات کو سختی سے رد کیا گیا اور ان کو برے انجام کی سخت ترین دھمکی دی گئی۔ یہ حرکات کرنے والوں کے نام بھی بعض روایات میں بتائے گئے ہیں لیکن یہ روایات پختہ نہیں' لہٰذا یہی پس منظر مناسب ہے جو ہم نے بیان کر دیا۔

ایسے شخص کو یہاں جو دھمکی دی گئی ہے وہ قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کی شکل میں ہے' جس میں عذاب کی ایسی تصویر ہے جو مادی بھی ہے اور معنوی بھی ہے۔ آگ کی مادی اور حسی تصویر بھی کھینچی گئی ہے اور معنوی تصویر بھی۔ یہاں جرم و سزا اور طریقہ سزا اور عذاب کی فضا کے درمیان تقابل کی مناسبت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ایک ایسے ھمزہ (جو اشاروں سے لوگوں کا مذاق اڑاتا ہے) اور ایسے لمزہ (جو دوسروں کی صفات اور عزت پر زبان درازی کرتا ہے) کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ جس کا مشغلہ مال جمع کرنا ہے اور جو اس مال کو قاضی الحاجات بھی سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ یہ مال ہی اسے دوام بخشے گا جو مال کی وجہ سے اپنے آپ کو برتر سمجھتا ہے۔ اور جو مال ہی کو تمام قوتوں کا سرچشمہ سمجھتا ہے' لیکن ایسے شخص کی تصویر کے بالمقابل ایک دوسرے شخص کی تصویر ہے جو پرے پھینکا ہوا ہے' ناقابل التفات ہے اور اَلْحُطَمَۃ "چکنا چور کر دینے والی جگہ" میں پھینک دیا گیا ہے۔ یہ سزا اس کے لیے اس لیے تجویز ہوئی ہے کہ اس کے جسم کے ساتھ ساتھ اس کی کبریائی اور بڑائی کے زعم کو بھی پاش پاش کر دے اور یہ اَلْحُطَمَۃ ہے کیا نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ (۱۰۴:۶) "اللہ کی آگ خوب بھڑکائی ہوئی"۔ اس آگ کو اللہ کی آگ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ نادر

اور غیر معمولی آگ ہے' اس سے سننے والے پر ہوش ربا خوف اور دہشت طاری ہو جاتی ہے۔

اَلَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (۱۰۴ : ۷) "جو دلوں تک پہنچے گی"۔ اس شخص کے دل تک' جس کے هُمَزَةٍ لُمَزَةٍ (۱۰۴ : ۱) کا فعل قبیح ابھرتا ہے اور جس کے اندر مزاج' تکبر اور غرور کا مواد چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہ تصویر اس طرح مکمل ہوتی ہے کہ اس پھینکے ہوئے' نظرانداز کیے ہوئے اور پاش پاش کر دیئے گئے شخص کو جس آگ میں پھینکا گیا ہے وہ اس کے روبرو سپرد کر دی گئی ہے۔ کوئی اس سے نکل نہ سکے گا۔ کوئی وہاں اس کو پوچھنے کے لیے نہ آئے گا۔ اس آگ میں بھی یہ شخص ستونوں کے ساتھ بندھا ہوا ہو گا' جس طرح مویشیوں کو باڑوں میں باندھ دیا جاتا ہے۔ اس تصویر کشی کے لیے الفاظ کا جو رنگ استعمال کیا گیا ہے وہ بہت ہی شدید اور شوخ ہے۔

عَدَّدَہ --- کَلَّا لَیُنْبَذَنَّ --- تَطَّلِعُ --- مُّمَدَّدَۃٍ پھر جملوں کی جو تراکیب ہیں وہ بھی نہایت موکد اور زوردار ہیں۔

كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ (٤) وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ (٥) نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ

(۱۰۴ : ۶) "البتہ وہ شخص تو لازماً ایک چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ چکنا چور کر دینے والی جگہ؟ وہ اللہ کی آگ ہے' خوب بھڑکائی ہوئی"۔ پہلے اسے مجمل لفظ سے تعبیر کیا گیا۔

اَلْحُطَمَۃ جہنم کے لیے صریح نہیں ہے اور یہ مبہم لفظ تھا۔ اس کے بعد اسے مزید خوفناک بنانے کے لیے سوال کیا تھا۔ اور اس کے بعد جواب دیا گیا اور تشریح کر دی گئی۔ یہ تمام اسالیب تاکید اور ہولناکی اور عظمت کے بیان کے لیے آتے ہیں' اور پھر انداز بیان تاکید کے ساتھ تہدید آمیز بھی ہے۔

وَیْلٌ "ہلاکت ہے اس کے لیے"۔ لَیُنْبَذَنَّ "اسے ضرور پھینکا جائے گا"۔ اَلْحُطَمَۃ "پاش پاش کرنے والی ہیں"۔ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ (۱۰۴ : ۶) "اللہ کی آگ جو خوب بھڑکائی ہوئی ہے"۔ اَلَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (۱۰۴ : ۷) "جس کے اثرات دلوں تک پہنچیں گے"۔ اِنَّھَا عَلَیْھِمْ مُّؤْصَدَۃٌ (۱۰۴ : ۸) "اونچے ہوئے ستونوں میں بندھے ہوئے ہوں گے"۔ اس تصویر کشی کے لیے جو الفاظ چنے گئے ہیں ان میں تصویری اور شعوری مناسبت ہے ہمز اور لمز کا فعل بد کرنے والے شخص کے ساتھ۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم دعوت اسلامی کی رفتار پر نظر رکھ رہا تھا اور یہ قرآن ہی تھا جو روز مرہ کے واقعات پر تبصرہ کر کے رہنمائی کرتا تھا اور یہ بروقت راہنمائی ایک ایسا ہتھیار تھا جو دشمنوں کی سازشوں کا تانا بانا کاٹ کر رکھ دیتا تھا بلکہ ان پر ایک خوف طاری کر دیتا تھا اور اہل ایمان کی روحیں اطمینان سے سرشار ہو جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان دو تصویروں کی جو مذمت فرمائی ہے اس میں ہمیں حکمت کے دو نکات نظر آتے ہیں۔

(۱) یہ کہ اسلامی سوسائٹی اخلاقی گراوٹ کو قبول نہیں کرتی۔ اور اس قسم کے لوگ جہاں اور جس معاشرے میں ہوں

وہ قابل مذمت ہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی مدافعت فرماتا ہے اور ان کو اس بات سے بچاتا ہے کہ لوگوں کے اس توہین آمیز رویے سے کہیں ان میں احساس کمتری پیدا نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس سورت میں ان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے' اللہ دیکھ رہا ہے' اللہ اسے ناپسند کرتا ہے' اس پر ان کو سزا دے رہا ہے' اس طرح اہل ایمان روحانی تائید پاتے ہیں' اور ان کے اندر اخلاقی برتری کا احساس پایا جاتا ہے اور ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ ان کے خلاف جو سازشیں ہو رہی ہیں وہ بہت ہی گھناؤنی ہیں اور گھٹیا لوگوں کی طرف سے ہیں۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۂ الفیل ـ ۱۰۵

۱-- تا -- ۵

سورۂ الفیل ایک نظر میں

اس سورت میں ایک ایسے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' جو جزیرۃ العرب میں بہت مشہور تھا۔ یہ واقعہ بعثت نبوی سے قبل پیش آیا تھا' اور اس سے یہ بات عیاں ہوگئی تھی کہ اس خطہ مبارکہ پر اللہ کا کس قدر کرم ہے اور یہ کہ اللہ نے اسے منزل نور اور مہبط ہدایت اور آخری وحی کے مرکز کے لیے منتخب کر لیا ہے' اور یہ علاقہ جدید نظریہ کا گہوارہ قرار دیا ہے اور یہ کہ یہ نقطہ آغاز ہے جہاں سے یہ جدید عقیدہ پوری دنیا میں جاہلیت کا پیچھا کرنے والا تھا۔ اور اس طرح اللہ کے منشا اور ہدایت کے مطابق دنیا میں ہدایت' حق اور بھلائی نے ثبوت و قرار پکڑنا تھا۔

اس حادثہ کے بارے میں جو متعدد روایات وارد ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ یمن کے حبشی حاکم ابرہہ نے یمن میں ایک کنیسہ بنایا' یہ اس وقت کی بات ہے جب ابرہہ نے یمن کو فتح کر لیا اور یہاں سے ایرانیوں کو نکال دیا۔ یہ کینسہ اس نے حبشہ کے بادشاہ کے نام سے بنوایا اور اس میں برتری اور عظمت کے تمام اسباب فراہم کیے۔ مقصد یہ تھا کہ تمام عرب بشمول اہل یمن و اہل شمال خانہ کعبہ کا جو بے حد احترام کرتے تھے اور ان کو اس سے جو بے حد محبت تھی' ان کو بیت اللہ سے موڑ کر اس نئے گرجا کا گرویدہ بنا دیا جائے' اس نے شاہ حبشہ سے اپنی اس پالیسی کی منظوری بھی لی۔

لیکن عربوں کے دل سے اپنے مقدس مقام خانہ کعبہ کی محبت نہ نکلی کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی اولاد سے ہیں اور انہوں نے اس گھر کو تعمیر کیا ہے اور یہ ان کی شناخت ہے کیونکہ عرب نسب اور قوم پر بہت فخر کرتے تھے۔ اور عربوں کے عقائد اور نظریات' ان کی نظر میں انہی کمزوریوں کے باوجود ان کو اہل کتاب کے معتقدات اور نظریات سے بہتر نظر آتے تھے کیونکہ اہل کتاب کے نظریات بھی اصل حقیقت سے بہت دور ہوگئے تھے۔

جب ابرہہ نے دیکھا کہ لوگ خانہ کعبہ سے اس کے بنائے ہوئے کینسہ کی طرف نہیں لوٹ رہے ہیں تو اس نے فیصلہ کیا کہ خانہ کعبہ کو منہدم کر دیا جائے۔ اس نے ایک ہزار لشکر تیار کیا جس کے آگے ہاتھیوں کا دستہ تھا اور ان کے آگے پھر ایک بڑا ہاتھی تھا جو ان کے نزدیک جنگ میں بہت مشہور تھا۔ عربوں کو ابرہہ کے ارادے کی اطلاع ہوگئی اور وہ اس بات سے بہت پریشان ہوئے کہ اب ان کا یہ مقدس گھر گرا دیا جائے گا۔ اہل یمن کے روساء اور بادشاہوں میں سے ایک شخص ذونفر نے اپنی قوم کو بلایا۔ پورے بلاد عرب میں سے جن لوگوں نے اس کی دعوت پر لبیک کہا۔ ان کے ساتھ ابرہہ سے لڑا لیکن وہ شکست کھا گیا اور ابرہہ نے اسے گرفتار کر لیا۔

اس کے بعد ابرہہ کا راستہ نفیل ابن حبیب خثعمی نے روکا' جس کے ساتھ دو قبیلے تھے اور تمام دوسرے عرب قبائل نے بھی ایک بڑی تعداد میں اس کا ساتھ دیا۔ ابرہہ نے ان کو بھی شکست دی اور نفیل مذکور کو قیدی بنا لیا۔ نفیل اس بات پر راضی ہوگیا کہ وہ عرب کے علاقوں میں ابرہہ کے لیے گائیڈ کا کام کرے گا۔

جب یہ طائف پہنچا تو ثقیف کے کچھ لوگ اس سے ملے اور انہوں نے کہا کہ جس گھر کو وہ گرانے نکلا ہے وہ طائف

میں نہیں ہے ۔وہ تو مکہ میں ہے ۔ان کا مقصد یہ تھا کہ انہوں نے لات بت کے لیے جو گھر بنایا تھا' اس کا منہ اس سے موڑ دیں ۔انہوں نے اس کو خانہ کعبہ تک پہنچنے کے لیے گائیڈ دیئے ۔

جب ابرہہ مکہ اور طائف کے درمیان مقام مغمس تک پہنچا تو اس نے اپنے جرنیلوں میں سے ایک جرنیل کو مکہ بھیجا تو اس نے پورے تہامہ کے علاقے سے مال مویشی پکڑ کر ابرہہ کے پاس بھیجے ۔جن میں قریش کے مال مویشی بھی تھے ۔اور عبدالمطلب سے ابن ہاشم کے دو صد اونٹ بھی تھے ۔عبدالمطلب اس زمانے میں قریش کے سردار تھے ۔چنانچہ قریش ' کنانہ ' ھذیل اور دوسرے قبائل جو خانہ کعبہ کے اردگرد تھے ' نے ارادہ کیا کہ ابرہہ کے ساتھ لڑیں ۔انہوں نے جب جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ ابرہہ کے ساتھ نہیں لڑ سکتے ۔تو انہوں نے آخر کار لڑنے کا ارادہ ترک کر دیا ۔

ابرہہ نے اپنا ایک ایلچی مکہ بھیجا تا کہ ' یہاں کے سردار کو مل کر یہ کہہ دے کہ وہ لوگوں کے ساتھ لڑنے کے لیے نہیں آیا ۔اس کا مقصد صرف اس گھر کو ڈھانا ہے ۔اگر وہ اس کی راہ نہ روکیں تو اسے ان کے خون بہانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے ۔

ابرہہ نے اپنے ایلچی کو ہدایات دیں کہ اگر مکہ کا سردار لڑنا نہیں چاہتا تو اسے ساتھ لے آئے ۔اس موضوع پر جب عبدالمطلب نے اپنے لوگوں سے بات چیت کی تو ان سے کہا کہ ہم جنگ نہیں چاہتے اور نہ جنگ کی طاقت رکھتے ہیں ۔یہ اللہ کا گھر ہے اور اللہ کے دوست ابراہیم خلیل اللہ کا گھر ہے ۔اگر اللہ اس کا دفاع کرے تو یہ اس کا گھر اور حرم ہے ۔اور اگر اللہ ابرہہ کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ اس کو گرا دے تو اس کی رضا ۔ہم تو دفاع کی قوت نہیں رکھتے" ۔اس مشورے کے بعد عبدالمطلب ابرہہ کے ایلچی کے ساتھ چلے گئے ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عبدالمطلب تمام لوگوں میں نہایت خوش شکل ' رعب دار اور پروقار شخص تھے ۔جب ابرہہ نے انہیں دیکھا تو ان کا بڑا احترام کیا ۔اور یہ پسند نہ کیا کہ انہیں تخت سے نیچے بٹھائیں ۔اور یہ بھی اس نے مناسب نہ سمجھا کہ تخت کے اوپر وہ اس کے مساوی بیٹھیں ۔چنانچہ ابرہہ اپنے تخت سے اترا تو فرش پر بیٹھا اور عبدالمطلب کو بھی ساتھ بٹھایا ۔اس کے بعد اس نے اپنے ترجمان سے کہا کہ "اسے کہو تم کیا چاہتے ہو؟" تو انہوں نے جواب دیا" میرا مطالبہ یہ ہے کہ بادشاہ دو سو اونٹ دے دے جو میری ملکیت ہیں" ۔جب عبدالمطلب نے یہ کہا تو ابرہہ نے اپنے ترجمان سے کہا کہ اسے یوں کہو : "جب میں نے تمہیں دیکھا تو تمہاری شخصیت سے میں بہت متاثر ہوا ۔لیکن جب تم نے میرے ساتھ بات کی تو میں سمجھتا ہوں کہ تم کچھ بھی نہیں ہو ۔کیا تم مجھ سے صرف دو سو اونٹوں کے بارے میں بات کرتے ہو؟ اور اس گھر کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہتے ۔جو تمہارا دینی مرکز ' تمہارے باپ کا دینی مرکز ہے اور میں اسے گرانے کے لیے آیا ہوں" ۔اس پر عبدالمطلب نے کہا :"میں تو ان دو سو اونٹوں کا مالک ہوں اور اس گھر کا مالک موجود ہے اور وہ عنقریب اس کا دفاع کر لے گا" ۔اس پر ابرہہ نے کہا "وہ میرا مقابلہ نہیں کر سکتا" ۔عبدالمطلب نے کہا تم جانو اور تمہارا کام ۔اس کے بعد ابرہہ نے عبدالمطلب کے اونٹ لوٹا دیئے ۔

عبدالمطلب مکہ واپس ہوئے ' بات چیت کے بارے میں لوگوں کو مطلع کیا اور حکم دیا کہ شہر کو خالی کر دو اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر پناہ لے لو ۔اس کے بعد عبدالمطلب اٹھے اور قریش کے کچھ دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ ہو لیے ۔عبدالمطلب نے خانہ کعبہ کا کنڈا پکڑا اور اس کے ساتھ کچھ دوسرے لوگ کھڑے ہو گئے ' وہ اللہ سے زاری کرنے لگے '

اس کی مدد کے طلبگار ہوئے اور روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے اس موقعہ پر یہ اشعار پڑھے

لاهم ان العبد يمنع رحله فامنع رحالك

لا يغلبن صليبهم ومحالهم ابدا محالك

ان كنت تاركهم وقبلتنا فامر ما بدا لك

"(۱) اے اللہ ہر بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے' تو اپنے گھر کی حفاظت فرمایا۔ (۲) ان کی صلیب اور ان کی تدبیر تیری تدبیر پر غالب نہ آئے۔ (۳) اگر تو ان کو ہمارے قبلے کو اپنے حال پر چھوڑتا ہے تو بھی جس طرح چاہے حکم دے"۔

ابرہہ نے اپنی فوج اور ہاتھی کو اپنی منزل کی طرف بڑھایا' مکہ کے قریب آکر ہاتھی پر بیٹھ گیا اور مکہ کے اندر داخل نہ ہوا۔ انہوں نے بے حد کوشش کی کہ ہاتھی کو مکہ میں داخل کریں مگر وہ کامیاب نہ ہوئے۔ اور یہ بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے بھی ثابت ہے جب حضورؐ کی اونٹنی قصواء مکہ کے باہر آکر بیٹھ گئی۔ تو لوگوں نے کہا کہ قصواء بگڑ گئی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ قصواء بگڑ کر نہیں بیٹھ گئی اور نہ یہ اس کی عادت ہے' لیکن اسے اس ذات نے روک دیا ہے جس نے ہاتھی کو روکا تھا"۔ (بخاری) اور صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا "اللہ نے مکہ سے ہاتھی کو روکا اور اپنے رسولؐ اور اہل ایمان کو اس پر مسلط کر دیا۔ اور آج مکہ کا احترام اسی طرح لوٹ آیا جس طرح کل وہ محترم تھا۔ یاد رہے کہ یہ بات ہر سننے والا غائب تک پہنچا دے"۔ لہٰذا یہ ایک مستند بات ہے کہ اصحاب فیل کے دن اللہ نے ہاتھی کو مکہ سے روک دیا تھا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ اللہ نے اس لشکر اور اس کے قائدین کو ہلاک کر دیا۔ اس لشکر پر غول کے غول پرندے بھیجے گئے' یہ پرندے ان پر کیچڑ سے بنی ہوئی کنکریاں پھینکتے تھے اور اس کے نتیجے میں اس لشکر کی حالت یہ ہوگئی جس طرح درختوں کے خشک پتے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں جس کی تفصیل قرآن نے بیان کی ہے۔ ابرہہ کا جسم بھی متاثر ہوا۔ یہ لوگ اسے اٹھا کر لے گئے۔ اس کا پورا پورا گر رہا تھا۔ اسے صنعا تک پہنچایا گیا۔ اور جس طرح روایات میں آتا ہے کہ اس کی موت یوں ہوئی کہ اس کا سینہ شق ہوا اور اس کا دل اس سے باہر نکل آیا۔

روایات میں ان پرندوں کے غولوں کے بارے میں اختلاف ہے کہ ان کی شکل کیسی تھی' حجم کیا تھا' ان پتھروں کا حجم کیسا تھا' ان کی نوعیت اور اثرات کیسے تھے جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے۔ اس سال مکہ میں چیچک اور خسرہ کی وبا بھی پھوٹی۔

وہ لوگ جو یہ میلان رکھتے ہیں کہ خوارق عادت واقعات اور معجزات کے دائرے کو تنگ کر دیں اور واقعات کو اللہ کے ان قوانین کے اندر اندر دیکھا جائے جو اللہ نے جاری کیے ہیں اور جو مالوف ہیں' یہ خیال کرتے ہیں اور زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ واقعہ چیچک اور خسرے کی وجہ سے پیش آیا۔ الا یہ کہ لفظ "طیر" کا اطلاق عربی میں ہر اڑنے والی چیز پر ہوتا ہے جس میں مکھی مچھر شامل ہیں جو جراثیم کو ادھر ادھر منتقل کرتے ہیں۔

امام مفتی محمد عبدہ پارہ عم کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "اگلے روز لشکر میں چیچک اور خسرہ کی وبا پھوٹ پڑی۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ چیچک کی یہ پہلی وبا تھی۔ یعقوب ابن عتبہ کا قول ہے کہ چیچک کی وبا سب سے پہلے اسی سال پھیلی اور خسرہ بھی اسی سال دیکھا گیا۔ اس وبا نے ان کے اجسام پر انوکھے اثرات ڈالے۔ لوگوں کے جسموں سے گوشت کٹ کر گرنے لگا جب یہ

واقعات شروع ہوئے تو لشکر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ لوگ بھاگنے لگے۔ اس بیماری کا اثر ابرہہ پر بھی ہوا۔ اس کے جسم کا گوشت بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرنے لگا۔ یہاں تک کہ سینہ تک پھٹ گیا اور صنعا پہنچ کر مر گیا"۔

"اس پر روایات متفق ہیں اور اس کو ماننا چاہیے۔ سورت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیچک اور خسرہ ان پرندوں کی وجہ سے پھیلا جو لشکروں کی صورت میں غول در غول ہوا میں اڑ کر آتے اور لشکر پر برستے؟"

"یہ اعتقاد کیا جا سکتا ہے کہ یہ پرندے مچھر اور مکھی کے جنس سے تھے جن کی وجہ سے جراثیم پھیلتے ہیں۔ اور سنگریزے اس خشک مٹی کے ہوں گے جسے ہوائیں اڑاتی ہیں۔ اور جانوروں' پرندوں اور مچھروں اور مکھیوں کے ذریعہ ادھر ادھر منتقل ہوتے ہیں۔ یہ زہریلا غبار انسانوں کے مساموں میں داخل ہو جاتا ہے اور اس سے پھوڑے اور زخم پیدا ہو جاتے ہیں۔ بدن خراب ہو جاتا ہے اور گوشت کٹ کر گرتا ہے۔ یہ پرندے' مکھی اور مچھر اللہ کے لشکروں میں سے ہیں اور انہی کے ذریعہ اللہ کئی لوگوں کو ہلاک و برباد کرتا ہے۔ یہ چھوٹے سے جانور جن کو جرثومہ اور جراثیم کہا جاتا ہے' یہ بھی اللہ کے لشکر ہیں۔ اور ان لشکروں کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے۔ باغیوں اور سرکشوں کو ہلاک کرنے کے لیے اللہ کی قدرت اس پر موقوف نہیں ہے کہ وہ پرندے بڑے بڑے ہوں' پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرح یا یہ کہ وہ عنقا کی طرح عجیب و غریب پرندے ہوں یا ان کے مخصوص رنگ ہوں۔ نہ اللہ کی قوت سنگریزوں کے سائز پر موقوف ہے۔ اور نہ ان تفصیلات پر کہ جسم پر ان کے اثرات کس طرح نمودار ہوئے۔ کیونکہ ہر شے دراصل اللہ کی فوج کی حیثیت رکھتی ہے۔

وفي كل شئ له اٰية — تدل على انه واحد

"اور ہر چیز میں اللہ کے نشانات ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہی وحدہ لاشریک ہے"۔

اس کائنات کے تمام قوانین اللہ کی مطیع فرمان ہیں۔ چنانچہ اللہ نے اس سرکش انسان کی سرزنش کے لیے ایسے پرندے بھیجے' جنہوں نے اس تک خسرے اور چیچک کے جراثیم پہنچا دیئے' وہ ہلاک ہوا' اس کی فوج تتر بتر ہو گئی۔ یہ لوگ مکہ میں داخل نہ ہو سکے اور اہل مکہ پر یہ اللہ کا خاص فضل و کرم تھا' جو ان کی بت پرستی کے باوجود ان پر کیا گیا۔ اور یہ کام اللہ نے اپنے گھر کی حفاظت کے لیے کیا اور یہ بات تمہید تھی رسول آخر الزمان کی آمد کے لیے تاکہ وہ آئیں اور اپنے آخری دین سے اس گھر کو مزید مستحکم کر دیں۔ اس طرح اللہ نے بیت اللہ کے مخالفین پر عذاب نازل کیا جو بغیر کسی جواز کے اس کو ڈھانے کے لیے آئے تھے اور انہیں تباہ کر دیا"۔

اس سورہ کی تفسیر میں یہی بات قابل اعتماد ہے اور اگر اس کے خلاف کوئی صحیح روایت بھی ہو تو اس کی تاویل کرنا چاہئے۔ تاویل کے بغیر قبول کرنا درست نہ ہو گا۔ کیا یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ نہیں ہے کہ جو سرکش ہاتھی جیسے قوی الجثہ حیوان کا سہارا لیتا ہے' اسے اللہ ایک چھوٹے سے حیوان جرثومے کے ذریعہ جو صرف خوردبین سے نظر آتا ہے' تباہ و برباد کر دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دانش مند انسان کے لیے یہ عظیم تر معجزہ ہے اور عجیب و غریب ہے"۔

ان آیات کی تفسیر میں دو انتہائی آراء اختیار کی گئی ہیں' ایک یہ جس طرح امام عبدہ کہتے ہیں کہ یہ خسرے کی اور چیچک کی وبا تھی جس کے جراثیم پرندوں کے پاؤں کے ساتھ اٹی ہوئی مٹی کے ذریعہ پھیلے اور دوسری یہ کہ جس طرح روایات میں آتا ہے کہ پرندے جو پتھر پھینکتے تھے وہ بذات خود لوگوں کے سروں اور جسموں کو جلا دیتے تھے' یہ پتھر جسموں

کے اندر داخل ہو کر ان کو ریزہ ریزہ کر دیتے تھے اور اس طرح کر دیتے تھے جس طرح خشک پتھروں کے ٹکڑے ہوتے ہیں جس طرح کھایا ہوا بھوسہ ہوتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان میں سے کون سی صورت زیادہ اللہ کی قدرت پر دلالت کرتی ہے یا اس واقعہ کی تفسیر کے لیے کون سی بہتر ہے۔ دونوں کا امکان بہرحال ہے۔ اور اس بات کا امکان ہے کہ اللہ کسی قوم کو اس ذریعہ سے ہلاک کرے جو معلوم و مالوف ہو یا کسی ایسے ذریعہ سے ہلاک کرے جو ہمارے حد ادراک سے ماوراء ہو اور ہم ابھی اسے جان نہ سکے ہوں۔

اللہ کی سنت فقط یہ نہیں ہے جسے لوگ جانتے ہوں اور اس کے جاری رہنے کے وہ عادی ہوں۔ جبکہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ انسان ابھی تک سنن الٰہیہ کے بالکل ایک معمولی حصے کو معلوم کر سکا ہے اور اس کا علم اس کی طاقت کے حدود کے اندر ہے اور جس قدر سنن الٰہیہ کو انسان نے اپنے طویل تجربات اور اس کے نتیجے میں آنے والی معلومات و مدرکات کے ذریعہ معلوم کیا ہے جن باتوں کو لوگ معجزات کہتے ہیں وہ بھی دراصل اللہ کے جاری کردہ قوانین ہیں' یہ عجیب اور خارق عادت اور معجزہ صرف انسان کو نظر آتے ہیں۔ انسانی محدود علم کے مطابق وہ معجزہ ہوتے ہیں۔

لہٰذا ایسے خوارق کا ذکر پڑھ کر ہم نہ کوئی تردد کرتے ہیں اور نہ فضول تاویلات کرتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ روایات صحیح ہوں اور نصوص و روایات میں ایسی بات ہو جو معجزہ نظر آتی ہو اور لوگوں کے مالوف اور عادی طریقے کے برعکس ہو اور معجزہ ہو۔ نیز یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اگر کوئی واقعہ انسانی مشاہدات کے مطابق ہو تو وہ کم اعجازی شان رکھتا ہے بمقابلہ اس واقعہ کے جو انسانی مشاہدے اور مالوف طریقے کے خلاف ہو' اور خارق عادت ہو۔ کیونکہ وہ سنن الٰہیہ جو معروف و مشاہد ہیں' وہ بھی انسانی قدرت کے مقابلے میں معجزانہ شان رکھتی ہیں۔ سورج کا طلوع و غروب ہر دن ہمارے مشاہدے میں ہے۔ اور ہم اس کے عادی ہیں لیکن یہ نظام اپنی جگہ ایک معجزہ ہے۔ ایک بچہ کی پیدائش نہایت ہی روٹین کی بات ہے۔ ہر وقت بچے پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن بچے کی ولادت ایک بڑا معجزہ ہے۔ اگر کوئی چاہے تو اس کا تجربہ کر لے۔ اور پرندوں کا اس لشکر پر مسلط کیا جانا' چاہے وہ جو بھی پرندہ ہو' اور ان کے ذریعہ ایسے جراثیم اس لشکر کی طرف منتقل کیا جانا جن سے چیچک اور خسرہ کی وبا پھوٹ پڑے اور یہ جراثیم ایک مخصوص وقت میں مخصوص جگہ پر پیدا کرنا جس پر ایک لشکر حملے کے لیے تیار ہو۔ اس انداز کا واقعہ بھی ایک معجزہ ہے بلکہ یہ معجزہ اپنے اندر کئی معجزات رکھتا ہے اور اس سے اللہ کی تقدیر اور اس کی قدرت کی وسعت معلوم ہوتی ہے۔ یہ معجزہ اس شکل کے معجزے سے کم نہیں جس میں کچھ مخصوص پرندے' مخصوص شکل کے پتھر اٹھائے ہوئے غول در غول آئیں' ایک مقررہ وقت میں لشکر پر حملہ آور ہوں اور وہ پتھر اس لشکر کے جسم میں معجزانہ نتائج پیدا کر دیں۔ اگر حقیقت بین نظر سے دیکھا جائے تو دونوں صورتیں معجزانہ ہیں اور دونوں برابر کا اعجاز رکھتی ہیں۔

جہاں تک اس مخصوص واقعہ کا تعلق ہے تو ہماری رائے یہ ہے کہ یہ ایک ایسا معجزہ ہے جو معمول کے مطابق نہیں ہے بلکہ خارق العادت اور غیر مالوف ہے۔ اللہ نے غیر معمولی قسم کے پرندے بھیجے جو ابابیل تھے۔ روایات میں ان کا حجم اور شکل اور صفات بھی بتائی گئی ہیں' لیکن ضروری نہیں ہے ایسی تمام روایات کو قبول کیا جائے۔ کیونکہ ایسے مقامات پر مبالغہ کیا جاتا ہے اور بات کو خوفناک بتایا جاتا ہے۔ بہرحال یہ پرندے غیر معمولی پتھر اٹھائے ہوئے تھے اور یہ جسموں پر غیر معمولی اثرات ڈالتے تھے۔

ہم اس واقعہ میں اس کے غیر معمولی ہونے کی طرف اس لیے مائل نہیں ہیں کہ اس صورت سے اللہ کی قدرت پر کچھ زیادہ روشنی پڑتی ہے یا حقیقت واقعہ میں کوئی عظمت پیدا ہوتی ہے بلکہ اس لیے کہ اس سورت کی فضا' واقعہ کے حالات میں یہ تفسیر زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ اس طرح اس گھر کی دھاک دلوں میں بٹھانا چاہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس گھر کی حفاظت اس لیے کرنا چاہتا تھا کہ یہ انسانوں کے لیے امن اور پناہ کی جگہ تھی اور اس کی اس حیثیت پر حرف نہ آئے۔اور اس لیے بھی کہ نبی آخرالزمان آنے والے تھے اور وہ اس دنیا کو ایک نئی نظریاتی سوسائٹی اور ایک نیا نظریہ دینے والے تھے اور اللہ کو منظور یہ تھا کہ یہ نیا عقیدہ مکہ سے آزادی کے ساتھ ترقی کرے اور نہایت آزادانہ فضا میں یہاں سے پھیلے اور کوئی خارجی قوت اس پر اثرانداز نہ ہو' اور یہاں کوئی ایسی بین الاقوامی قوت نہ ہو کہ وہ اس نئے عقیدے کو اس کے سرچشمے کے اندر ہی دبا دے اور گھیر لے۔اور اس لیے کہ یہ واقعہ سب لوگوں کے اور سب نسلوں کے لیے عبرت خیز ہو' اور قریش کو' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد' یہ بتایا جائے کہ دیکھو تم پر اس گھر کی وجہ سے اللہ کے کیا کیا احسانات ہوئے اور یہ کہ اس گھر کا نگران اللہ ہے' اس کی حرمت لازمی ہے اور اس واقعہ سے عبرت پکڑو۔ان حالات میں مناسب یہی ہے کہ یہ واقعہ غیر معمولی ہو اور اس کے تمام اجزاء اور تمام عناصر غیر معمولی ہوں' فضا بھی غیر معمولی ہو تو ہمارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ بتکلف اسے ایک معمولی واقعہ کی شکل میں پیش کریں۔

روایات میں اس واقعہ کے نتیجے میں جو اثرات بتائے گئے ہیں' وہ اثرات بالعموم چیچک اور خسرے کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوتے۔ اس واقعہ میں فوج اور اس کے کمانڈر کے اجسام ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اور ان کے پورے پورے گر گئے۔اور سینہ پھٹ کر دل باہر آ گئے۔یہ واقعات چیچک اور خسرے کی بیماری میں کب ہوتے ہیں اور خود سورت بتاتی ہے کہ اس واقعہ کے اثرات غیر معمولی تھے۔

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ (۱۰۵ : ۵) "ان کو جانوروں کے کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا"۔اس میں اس واقعہ کے غیر معمولی ہونے کی طرف براہ راست اشارہ ہے۔

عکرمہ کی روایت اور یعقوب ابن عتبہ نے جو بیان کیا وہ اس بارے میں منصوص نہیں ہے کہ ابرہہ کی فوج یا وہ چیچک یا خسرے سے ہلاک ہوا' ان روایات میں صرف یہ بات صراحت سے کہی گئی ہے۔کہ اسی سال عرب میں چیچک اور خسرہ کی وبا پہلی مرتبہ پھیلی۔ان کے اقوال میں اس طرف اشارہ تک نہیں ہے کہ ابرہہ یا اس کا لشکر اس وبا میں مبتلا ہوا۔اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ پرندے اور پھر ان جراثیم کو صرف ابرہہ اور اس کے لشکر کی طرف منتقل کر رہے تھے اور یہ جراثیم عرب کے باشندوں پر اثر نہ ڈالتے تھے تو یہ بات بذات خود ایک خارق عادت معجزہ بن جاتی ہے۔اگر اس تاویل کے بعد بھی صورت معجزہ ہی کی رہ جاتی ہے تو پھر اس معجزے کو ایک معمولی اور مالوف واقعہ کی شکل دینے کے تکلف کی ضرورت کیا ہے۔محض اس لیے کہ یہ لوگوں کے فہم کے اندر آ جائے۔حالانکہ واقعہ کا ماحول اور پس منظر یہ تقاضا کرتا ہے کہ یہ معجزہ ہو۔

ہم ان حالات اور محرکات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جن کا دباؤ اس عقلی مکتب فکر پر تھا' جس کے صدر نشین ایک دور میں استاد محمد عبدہ تھے۔ان محرکات کی وجہ سے اس مکتب فکر نے قرآن مجید کی تفسیر میں اور اسلامی تاریخ کی تعبیر میں خارق

عادت واقعات اور معجزات کے دائرے کو محدود کرنے کی کوشش کی ۔ ان حضرات کی کوشش یہ تھی کہ ان معجزات اور واقعات کو ان قوانین قدرت کے مطابق بنایا جائے جو اس کائنات میں جاری ہیں ۔اس دور میں عامتہ المسلمین کے ذہنوں پر عجیب و غریب خرافات چھائے ہوئے تھے اور کتب تفسیر اور اسلامی تاریخ اسرائیلی خرافات سے بھری پڑی تھی' اور یہ دور ایسا تھا کہ اس میں سائنس اور جدید اکتشافات کا فتنہ اپنے عروج پر تھا اور لوگ دین کی اساسیات میں بھی شک کرنے لگے تھے اور فتنہ تشکیک اپنے عروج پر تھا۔اس مکتبہ فکر کی پالیسی یہ تھی کہ دین کو عقل کے مطابق بناکر عوام الناس میں دین پر اعتماد از سرنو بحال کیا جائے ۔اس لیے ان لوگوں نے بڑی کوشش کی کہ دین کو خرافات سے پاک کیا جائے ۔پھران لوگوں نے مسلمانوں کے اندر ایک ایسی فکر پیدا کی جس کے نتیجے میں مسلمان اس کائنات میں جاری و ساری سنن الٰہیہ کو بھی سمجھنے لگے اور یہ بھی سمجھنے لگے کہ یہ سنن الٰہیہ اٹل ہیں ۔اور جس طرح انسانی حرکات و سکنات ان سنن الٰہیہ کے تابع ہیں اسی طرح اس کائنات کے عظیم الجثہ کرات کی حرکات بھی انہی قوانین کے مطابق ہیں ۔اور یہ فہم اور یہ شعور قرآن کریم کے عین مطابق ہے ۔کیونکہ پورے قرآن میں لوگوں کو بار بار اس طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ ان قوانین فطرت پر غور کریں جو اس پوری کائنات میں جاری وساری ہیں اور اٹل ہیں ۔ان کے اندر تسلسل ہے اور تمام مفرد اور بکھرے ہوئے واقعات ان سنن کے مطابق ہیں ۔

اگرچہ اسی مدرسہ فکر پر ایک طرف سے خرافات کا دباؤ تھا' دوسری طرف سے سائنسی خرافات کا دباؤ تھا' لیکن اس دو طرفہ دباؤ کی وجہ سے یہ مدرسہ بھی توازن قائم نہ رکھ سکا اور اس کے اوپر کچھ برے اثرات بھی پڑے ۔یہ مدرسہ بہت محتاط ہوگیا اور انہوں نے یہ قرار دیا کہ وہ سنن الٰہیہ جن کو انسانوں نے سمجھ لیا ہے وہ کلی ہیں اور ان کے اندر استثناء ممکن نہیں ہے ۔

چنانچہ استاد محمد عبدہ' ان کے شاگرد استاد سید رشید رضا اور استاد شیخ عبدالقادر مغربی کی تفاسیر میں عام روش یہ اختیار کی گئی کہ جس قدر معجزات و خوارق عادت قرآن میں مذکور تھے ان کی ایسی تاویلات اور تعبیرات کی گئیں کہ وہ سائنس اور عقل انسانی کے مطابق ہو جائیں اور ایسے واقعات ہو جائیں جو معمول کے مطابق ہوتے ہیں اور انہوں نے بعض معجزات کی ایسی تفسیر کرنے کی کوشش کی کہ وہ معقول بن جائیں ۔ غرض انہوں نے تمام غیبی حقائق سے مکمل اجتناب کیا اور اس سلسلے میں سخت احتیاط سے کام لیا۔

ہم اس بات کو بھی سمجھتے ہیں کہ اس مکتب فکر نے کن عوامل کے تحت یہ روش اختیار کی اور اس کی قدر بھی کرتے ہیں ۔ لیکن ہم اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس مکتب فکر نے مبالغے سے کام لیا اور قرآن کریم کے ایک دوسرے اٹل فیصلے کو نظرانداز کر دیا کہ اللہ کی مشیت بے قید ہے اور اللہ ہرچیز پر قادر ہے ۔اور اللہ کی قدرت ان قوانین پر بھی حاوی ہے جو خود اللہ نے اس کائنات میں جاری کیے ۔اللہ کی مشیت کی یہ بے قیدی اور یہ آزادی اس بات کی نفی کرتی ہے کہ عقل کوئی آخری حاکم اور سپریم جج ہے اور عقل کی معقولات ہی آخری معیار ہیں ۔اگر کوئی بات ان معقولات کے خلاف ہے تو وہ قابل استرداد ہے اور اس کی تاویل ضروری ہے جیسا کہ ان حضرات کی تفاسیر اس روش سے اٹی پڑی ہیں ۔

نیز اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ اللہ کی سنن صرف ان سنن تک محدود نہیں ہیں جن کو تمہاری عقل نے ادراک کر لیا ہے ۔جن سنن الٰہیہ کو انسان نے سمجھا ہے وہ قوانین قدرت کا نہایت ہی معمولی حصہ ہیں ۔ اللہ کے

قوانین قدرت جو ہمیں معلوم ہیں اور جو معلوم نہیں (معجزات) دونوں دراصل اللہ کی قدرت پر دال ہیں اور اللہ کے نظام قضا و قدر کی دقت اور شمول پر دلیل ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم نہایت احتیاط سے کام لیں اور خرافات اور قصے کہانیوں کی نفی بھی اعتدال سے کریں۔ کسی خاص معاشرے میں پائے جانے والے مروج افکار سے متاثر نہ ہوں اور نہ کسی دور میں مروج اور قبول عام رکھنے والے افکار کو بے سوچے سمجھے قبول کریں۔

اس قسم کی قرآنی آیات کی تفسیر کے لیے ایک محفوظ اصول و انداز ہے۔ مناسب ہے کہ یہاں اس کی وضاحت کر دی جائے۔ وہ یہ کہ ہمیں کسی آیت پر اس طرح غور نہیں کرنا چاہئے کہ ہم پہلے اپنے ذہنوں میں کچھ اصول طے کر لیں، کچھ عوامی سوچوں کو قبول کر لیں اور ان موضوعات پر اپنے طور پر فیصلے کر لیں اور پھر آیات میں تاویل کریں بلکہ ہماری روش یہ ہونی چاہئے کہ ہم خالی الذین ہو کر قرآنی آیات سے نتائج اخذ کریں۔ ان آیات سے ایمان اور عقیدہ اخذ کریں اور ان آیات سے اپنی فکر اور اپنی سوچ اور اپنا ادراک اخذ کریں۔ اگر ان آیات میں کوئی بات طے شدہ ہو تو اسے طے شدہ سمجھیں۔ یہ اس لیے کہ جس چیز کو ہم عقل انسانی سمجھتے ہیں اور قرآنی اور تاریخی اور کائناتی واقعات کو اس کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں یہ تو انسان کے محدود تجربات کا نتیجہ ہے اور نہایت غیر یقینی چیز ہے۔

یہ عقل اگرچہ ایک مطلق قوت ہے اور یہ انفرادی واقعات و تجربات کے اندر محدود نہیں ہے۔ بلکہ عقل ان انفرادی واقعات سے ماوراء ایک مجرد حقیقت ہے لیکن یہ مجرد عقل بھی بہرحال ہمارے محدود وجود کے اندر ہی کی حقیقت ہے اور ہمارا وجود محدود اور مقید ہے۔ اصل وجود باری تعالیٰ کا ہے جو غیر محدود اور لا انتہا ہے۔ اور یہ قرآن اس اصل وجود کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ لہٰذا اصل حاکم وجود مطلق اور اس کا قرآن ہے۔ اور قرآن جو فیصلے کر دے ہمارا مقام یہ ہے کہ ہم اپنے فیصلے اور اپنے عقلی فیصلے قرآن سے اخذ کریں۔ اس لیے یوں کہنا درست نہیں ہے کہ اس نص کا مفہوم عقل سے متصادم ہے لہٰذا اس کی تاویل ضروری ہے۔ اور اس قسم کی عبارات اس مکتب فکر کے لوگوں کے کلام میں بہت سی ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم ہر وہم اور ہر کہانی اور تمام خرافات کے سامنے سپر انداز ہو جائیں۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ عقل قرآن کے فیصلوں کو پرکھنے کے لیے معیار نہیں ہے۔ جب قرآن کریم کا مفہوم اور اس کی تعبیر واضح اور سیدھی ہو، تو پھر یہ آیت ہی فیصلہ کرے گی کہ ہماری عقل اس کو کس طرح سے اخذ کرے اور کس طرح ہم اس آیت کی روشنی میں اپنے تصورات کے اصول وضع کریں اور ہمارا علم الکلام اس کی روشنی میں کس طرح وضع ہو، اور پھر تمام کائناتی حقائق کے بارے میں قرآنی منطق اور قرآنی طرز استدلال کو کس طرح متعین کیا جائے۔

اب ہم سورہ فیل اور اس میں بیان کردہ قصے کے مدلولات کی طرف آتے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۳۰۵ تشریح آیات

۱-- تا-- ۵

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ﴿۱﴾ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ﴿۲﴾ وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ﴿۳﴾ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۴﴾ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ﴿۵﴾ ع ۱ ۵ ع

۳۰

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا؟ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے جو ان کے اوپر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے' پھر ان کا یہ حال کر دیا جیسے (جانوروں کا) کھایا ہوا بھوسا"۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ (۱۰۵ : ۱) "تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟" یہ سوالیہ انداز تعجب انگیزی کے لیے اختیار کیا گیا ہے کہ یہ عجیب واقعہ تھا' اور اس میں بہت بڑی عبرت ہے اور اس میں عظیم معانی پوشیدہ ہیں۔ یہ واقعہ عربوں میں معروف و مشہور تھا۔ بلکہ اس واقعہ سے عربوں میں کیلنڈر شروع ہو گیا تھا اور یہ اہم تاریخ بن گیا تھا۔ لوگ کہتے فلاں واقعہ ہاتھی والوں کے سال ہوا' اور فلاں واقعہ عام الفیل سے دو سال پہلے ہوا۔ اور فلاں واقعہ عام الفیل کے دس سال بعد واقع ہوا۔ اور مشہور روایت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش بھی عام الفیل میں ہوئی اور یہ تقدیر کے فیصلوں کے مطابق عجیب اتفاق تھا۔

غرض اس سورت میں کوئی ایسا واقعہ بیان نہ ہوا تھا جسے وہ نہ جانتے ہوں۔ یہ ایک واقعہ تھا جو ان کے علم میں تھا اور قرآن نے ان کو یاد دلایا۔ اور مقصد اگلی جانب کی طرف متوجہ کرنا تھا۔

اس کے بعد کا فقرہ بھی سوالیہ ہے لیکن استفہام تقریری ہے' یعنی ایسا سوال جس کا جواب اثبات میں ہوتا ہے۔

اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَھُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ (۱۰۵: ۲) "کیا اس نے اس کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا"۔ یعنی ان کے مکر و تدبیر کو اس طرح بے راہ نہیں کر دیا کہ وہ نشانے پر نہ لگے اور اپنی منزل تک نہ پہنچے۔ اسی طرح جس طرح ایک انسان راہ گم کر دے اور منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ قریش کو یاد دلاتا ہے کہ اس نے ان پر انعام و احسان کیا۔ ان کی حمایت کی اور اس گھر کو بچایا اور اس وقت بچایا جب وہ خود ابرہہ کے لشکر جرار کا سامنا کرنے سے قاصر تھے۔ شاید کہ وہ شرم کریں اور اس ذات باری کا انکار نہ کریں۔ جس نے ان کی مدد نہایت کمزوری اور عاجزی کی حالت میں کی تھی۔ ان کا کردار اس وقت بعینہ اسی طرح کا ہے جس طرح ابرہہ کا تھا۔ وہ مکہ کے مٹھی بھر مسلمانوں کو اپنے غرور اور قوت کے بل بوتے پر روند ڈالنا چاہتے تھے۔ ان کو چاہیے کہ ذرا اس زور آور کا حال یاد کر لیں جس نے بیت اللہ پر چڑھائی کی تھی اور اس کی حرمت کو پامال کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اللہ یہ طاقت رکھتا ہے کہ جس طرح اس نے بیت اللہ کو بچایا' اسی طرح اس کی دعوت کو لے کر چلنے والی حزب اللہ کو بھی بچائے۔

سوال یہ ہے کہ اللہ نے پھر ان کی مکاری کو کس طرح گمراہ اور خطا کر دیا' تو اس کی تصویر کشی بھی قرآن کریم نہایت خوبصورت انداز میں کرتا ہے۔

وَّ اَرْسَلَ عَلَیْھِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ (۳) تَرْمِیْھِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ (۴) فَجَعَلَھُمْ کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ (۵) (۱۰۵: ۳ تا ۵) "اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے جو ان کے اوپر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے' پھر ان کا یہ حال کر دیا جیسے (جانوروں کا) کھایا ہوا بھوسا"۔

اَبَابِیْلَ (۱۰۵: ۳) کے معنی جھنڈ کے ہوتے ہیں۔

سِجِّیْلٍ (۱۰۵: ۴) فارسی سے معرب ہے اور دو لفظوں سے مرکب ہے "سنگ گل" یعنی مٹی کو پکا کر اس سے پتھر بنا دیا گیا تھا' یا ایسے پتھر تھے جو کیچڑ کے ساتھ آلودہ تھے۔

کَعَصْفٍ (۱۰۵: ۵) کے معنی ہیں درختوں کے خشک پتے۔ عصف کی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ ماکول ہے۔ یعنی کھایا ہوا ہے یعنی پتوں کی حالت یہ ہے کہ ان کو حشرات الارض نے کھا کر پیس دیا ہے' یا حیوانات نے چبا کر ریزہ ریزہ کر دیا اور پیس دیا ہے۔ یہ ایک حسی تصویر کشی ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پرندوں کے جھنڈ ان پر پتھر مارتے تھے تو ان کے اجسام ریزہ ریزہ ہو جاتے تھے۔ لہٰذا ایسی تاویلات کی ضرورت نہیں ہے کہ چیچک یا خسرے کی وجہ سے ان کے اجسام ریزہ ریزہ ہو گئے۔

اس واقعہ میں جو حقائق بیان ہوئے وہ کئی زاویوں سے ہمارے لیے عبرت انگیز اور بصیرت افروز ہیں:

(۱) اس سے پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ نے یہ پسند نہ فرمایا کہ وہ اپنے گھر کی حمایت اور اس کا بچاؤ مشرکین کے ذریعہ انجام دے۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو اس گھر کی طرف منسوب کرتے تھے' وہ اسے بچانے کی کوشش بھی کرتے اور اس میں پناہ بھی لیتے۔ جب اللہ نے ارادہ کیا کہ وہ اس گھر کو بچائے اور اس کی حفاظت کرے

اور اس کی حمایت کا اعلان کرے اور اس گھر پر غیرت کرے ' تو اللہ نے مشرکین مکہ کی حالت اس طرح کر دی کہ وہ اس جارح قوت کے سامنے بے بس ہو جائیں اور قدرت الٰہیہ بالکل عیاں ہو کر اپنے گھر کی حفاظت کرے جو ایک محترم گھر ہے تاکہ بیت اللہ کی حفاظت میں مشرکین کا کوئی تاریخی کردار نہ ہو۔ جس کے تحت حمیت جاہلیت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ یہ نکتہ اس بات کو بھی ترجیح دے دیتا ہے کہ اس حملہ آور لشکر کی ہلاکت میں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی اور معجزانہ انداز اختیار کیا۔ اور ان کی ہلاکت میں کوئی عام مالوف طریقہ اختیار نہ کیا گیا تھا۔ یہ بات زیادہ مناسب اور قرین قیاس ہے۔

خانہ کعبہ کی حمایت میں اس کھلی مداخلت کا تقاضا یہ تھا کہ قریش اور بیت اللہ کے اردگرد پھیلے ہوئے عرب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد خود اسلام میں داخل ہوتے اور بیت اللہ کی خدمت اور فوقیت پر فخر نہ کرتے اور بیت اللہ کے اردگرد انہوں نے بت پرستی کا جو جال پھیلا رکھا تھا وہ ان کے اسلام میں داخل ہونے کے لیے مانع نہ ہوتا مگر افسوس کہ انہوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں اس حادثہ کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ اہل قریش کو شرمندہ کیا جائے اور یہ گویا ان پر تنقید ہے اور ان کے معاندانہ موقف پر تعجب کا اظہار ہے کہ کیوں نہ انہوں نے اس واقعہ سے کوئی عبرت لی۔

(۳) اس سے تیسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ نے اہل کتاب ' ابرہہ اور اس کے لشکر کو توفیق نہ دی کہ وہ اس گھر کو گرا سکیں اور اس مقدس سرزمین پر اپنی حکومت قائم کر سکیں۔ اگرچہ اس کے باسی مشرک ہوں اور اگرچہ اس گھر کے متولی بھی مشرک ہوں ' تاکہ یہ گھر کسی بھی استعماری قوت کے تسلط سے آزاد رہے۔ اس علاقے میں کوئی بیرونی سازش کارفرما نہ ہو۔ اور اس سرزمین کی آزادی محفوظ ہو تاکہ اللہ کی تقدیر میں یہاں سے جو جدید دین اور جدید نظریہ اٹھنے والا تھا وہ آزادی کی فضا میں نمودار ہو۔ اس پر کسی حکومتی اقتدار کا دباؤ نہ ہو۔ اور کوئی بیرونی ڈکٹیٹر یہاں سرکشی نہ کر سکے اور کوئی دین اس دین سے برتر نہ ہو جو تمام ادیان کو اپنی گرفت میں لینے والا تھا اور جو پوری انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ اپنے ہاتھ میں لینے والا تھا۔ جو تمام انسانوں پر اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کرنے والا تھا ' جو پوری انسانیت کی رہنمائی کرنے والا تھا ' کسی سے رہنمائی لینے والا نہ تھا۔ یہ تھی اللہ کی تدبیر نبی آخر الزمانؐ اور آپؐ کے دین کے لیے۔ یہ بات اس وقت ہو رہی تھی ' جب کہ لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ اس نئے دین کا قائد اسی سال پیدا ہو گیا ہے۔

آج عالمی صلیبیت اور عالمی صیہونیت مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کو نہایت فاجرانہ اور لالچی نظروں سے دیکھتے ہیں اور ان کے ان مکارانہ منصوبوں کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں ' لیکن اس سورت سے ہمیں جو اشارات ملتے ہیں ان سے ہمیں ایک گونہ اطمینان نصیب ہو جاتا ہے کہ اسلام کے مقامات مقدسہ کے خلاف ان کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جس اللہ نے اپنے گھر کو اہل کتاب سے اس وقت بھی بچایا جب اس کے متولی اور مجاور مشرک تھے تو وہ اس کی حفاظت آج بھی کرے گا۔ اسی طرح اللہ اپنے نبی کے شہر کو بھی ان سازشوں اور للچائی ہوئی مکارانہ نظروں سے بچائے گا۔

(۴) چوتھی بات یہ کہ اس کرۂ ارض پر ماضی میں عربوں کا کوئی قابل ذکر کردار نہ تھا بلکہ اسلام سے قبل ان کا کوئی

وجود ہی نہ تھا۔یمن میں وہ اہل فارس اور حبشیوں کے غلام تھے ۔اگر کہیں جنوبی عرب میں ان کی کوئی حکومت قائم بھی ہوئی تو وہ ایرانیوں کے زیر انتداب تھی ۔شمال میں شام کا علاقہ رومی مملکت کے تحت تھا۔یہ علاقہ یا تو براہ راست رومی سلطنت کے تحت ہوتا یا وہ یہاں اپنے زیر حمایت کوئی عربی سلطنت قائم کرتے ۔ صرف جزیرۃ العرب کا قلب ہی ایسا علاقہ تھا جو کسی غیر حکومت کے اثر ورسوخ سے پاک تھا لیکن اس علاقے کا کوئی عالمی کردار نہ تھا۔یہ ایک پسماندہ بدوی علاقہ تھا۔اس علاقے میں جب قبائلی جنگ چھڑ جاتی تو یہ چالیس چالیس سال تک جاری رہتی ۔ اس انتشار کی وجہ سے ان علاقوں کے باشندوں کی کوئی وقعت قریبی ممالک کے ہاں نہ تھی ۔ ان کی جو جنگی حیثیت تھی اس کا اظہار ہاتھی والوں کی مہم کے دوران ہو گیا تھا کہ وہ کسی بیرونی حملہ آور کے مقابلے کی ہمت نہ رکھتے تھے ۔

عربوں کو عالمی کردار ادا کرنے کا موقعہ ' سب سے پہلے اسلام کے جھنڈے تلے نصیب ہوا۔ان کی ایک ایسی عالمی مملکت وجود میں آئی جس کی کوئی حیثیت تھی اور لوگ اس کا شمار بھی کرتے تھے ۔یہ دراصل سیلاب کی طرح ایک عالمی انقلاب تھا۔اس انقلاب میں کئی مملکتیں بہہ گئیں ' کئی تخت گر گئے اور انسانیت کی قیادت کا مقام عربوں کو حاصل ہو گیا۔یہ اس وقت ہوا جب اس کرۂ ارض پر سے گمراہ اور کھوٹی قیادتوں کے اختیارات زائل کر دیئے گئے ۔سوال یہ ہے کہ عربوں کو یہ مقام کب اور کیوں حاصل ہوا؟ یہ مقام انہیں اس وقت حاصل ہوا جب انہوں نے اس بات کو بھلا دیا کہ وہ عرب ہیں ۔ انہوں نے علاقائی ' نسلی اور لسانی عصبیت کے نعروں کو بھلا دیا۔انہوں نے صرف اس بات کو یاد رکھا کہ وہ مسلم ہیں اور صرف مسلم ہیں ۔انہوں نے صرف اسلام کے جھنڈے بلند کیے اور وہ ایک عظیم نظریہ حیات لے کر اٹھے اور اسے تمام انسانوں تک پہنچا دیا۔وہ انسانیت کے لیے رحم اور اس کے لیے بھلائی کے حامل بن گئے ۔انہوں نے نہ قومیت کا نعرہ بلند کیا' نہ نسلی عصبیت کا' بلکہ وہ ایک آسمانی ہدایت پر مبنی فکر لے کر اٹھے اور اسے ایک آسمانی ہدایت کے طور پر لوگوں تک پہنچایا۔ انہوں نے دین اسلام کو ایک دنیاوی مذہب اور دنیاوی نظریہ کے طور پر نہ لیا جس سے ان کا مقصد صرف یہ ہو کہ دنیا کی اقوام کو اپنا غلام بنا دیں ۔وہ عرب سے باہر صرف جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلے ' ان کا مقصد یہ نہ تھا کہ کوئی عربی امپیریلزم قائم کر دیں ' تاکہ اس کے زیر سایہ اس زمین پر خوب پھریں اور چگیں ۔ان کی ناک اونچی ہو ' اور وہ دنیا میں اس شہنشاہیت کی وجہ سے بڑے بن جائیں اور لوگوں کو رومیوں اور فارسیوں کی حکومت سے نکال کر عربوں کی حکومت میں داخل کر دیں بلکہ وہ اس لیے اٹھے تھے کہ لوگوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ وحدہ کی بندگی میں داخل کریں ۔ جیسا کہ یزدگرد کی مجلس میں مسلمانوں کے نمائندے حضرت ربعی ابن عامر نے کہا۔ ''اللہ نے ہمیں اس لیے اٹھایا ہے کہ ہم لوگوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کریں ۔اور دنیا کی تنگ دامنی سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں داخل کر دیں اور عوام کو دوسرے ادیان کے ظلم سے نکال کر اسلام کے انصاف میں داخل کریں''۔

یہ وہ وقت تھا جب دنیا میں عربوں کا وجود قائم ہوا' ان کو قوت ملی ' ان کی قیادت قائم ہوئی ' لیکن یہ دعوت اللہ کے لیے تھی اور یہ جہاد اللہ کی راہ میں تھا۔یہ قوت ایک عرصہ تک قائم رہی ' ایک زمانے تک وہ انسانیت کے قائد رہے ' جب تک کہ وہ اپنے طریقے پر قائم رہے ۔جب انہوں نے اسلامی نظریہ حیات سے انحراف کیا اور وہ قومی عصبیت کے داعی بنے اور انہوں نے اللہ کے جھنڈے بلند کرنے کی بجائے عصبیت کے جھنڈے اٹھا لیے ' تو زمین نے ان کو پرے پھینک دیا'

اقوام عالم نے انہیں روند ڈالا کیونکہ انہوں نے اللہ کو چھوڑ دیا تو اللہ نے ان کو چھوڑ دیا اور جس طرح انہوں نے اللہ کو بھلایا اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا۔

سوال یہ ہے کہ اسلام کے سوا عربوں کی حیثیت ہی کیا ہے؟ اگر وہ اسلامی عقیدہ' اسلامی تصورات اور افکار کو ایک طرف رکھ دیں تو ان کے پاس کیا چیز ہے جو وہ انسانیت کے سامنے پیش کر سکتے ہیں؟ اور اگر کسی قوم کے پاس انسانوں کے لیے کوئی پیغام نہیں ہے تو وہ قوم ہی کیا ہے؟ تاریخ عالم گواہ ہے کہ جن اقوام نے کبھی انسانیت کی قیادت کی' ان کے پاس ایک فکر تھی' ایک پیغام تھا جو انہوں نے انسانیت کو دیا۔ جن اقوام کے پاس کوئی پیغام نہ تھا مثلاً تاتاری' جنہوں نے پورے مشرق کو روند ڈالا اور برابر جنہوں نے عالم عرب پر سے رومیوں کی سلطنت کو ختم کیا۔ یہ لوگ طویل عرصہ تک زندہ نہ رہ سکے' بلکہ یہ ان اقوام ہی کے اندر پگھل گئے جن کو انہوں نے فتح کیا تھا۔ یاد رہے کہ عربوں نے انسانیت کو جس نظریہ سے نوازا وہ فقط اسلامی نظریہ حیات تھا۔ اس نظریہ کی وجہ سے وہ عالمی قیادت کے منصب پر فائز ہوئے۔ جب انہوں نے اس نظریہ کو پس پشت ڈال دیا تو اس کرۂ ارض پر ان کا کوئی کام ہی نہ رہا۔ تاریخ سے ان کا کردار ختم ہو گیا۔ آج عرب اگر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ اس سبق کو یاد رکھیں۔ اگر وہ قوت اور قیادت چاہتے ہیں ورنہ ان کی کوئی حیثیت قائم نہیں ہو سکتی۔ اللہ ہی ہے جو گمراہوں کو ہدایت دے سکتا ہے۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۂ قریش ـ ۱۰۶

۱-- تا-- ۴

درس نمبر ۳۰۶ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۴

سورۃ قریش (۲۹) مکیۃ
آیاتها ۴ رکوعها ۱
بسم اللہ الرحمن الرحیم

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۝۱ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیْفِ ۝۲ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا 1
الْبَیْتِ ۝۳ الَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝۴ ع ۴
۳۱

"چوں کہ قریش مانوس ہوئے (یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفروں سے مانوس' لہٰذا ان کو چاہئے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک سے بچاکر کھانے کو دیا اور خوف سے بچاکر امن عطا کیا"۔

خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد' جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے سامنے دست بدعا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ دعا یہ تھی :

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (۲ : ۱۲۶) "اے میرے رب' اس شہر کو امن کا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں کو پھلوں کی روزی دے"۔ تو اللہ نے اس گھر کو امن کا گھر بنا دیا اور ڈکٹیٹروں اور جباروں کے تسلط سے آزاد رکھا۔ جو شخص بھی اس گھر میں پناہ لیتا وہ امن پاتا اور اس کے ارد گرد جو اقوام و افراد رہتے تھے' وہ ہر وقت خائف رہتے تھے اور اس گھر کو یہ اعزاز اس وقت بھی حاصل رہا جب اس کے باسیوں نے بت پرستی شروع کر دی۔ شرک کا ارتکاب شروع کیا اور اپنے رب کے ساتھ ساتھ انہوں نے خانہ کعبہ میں بت بھی رکھ دیئے اور یہ اعزاز اللہ نے اس لیے بحال رکھا کہ اس گھر سے اللہ نے کچھ کام لینا تھا۔

پھر جب اصحاب الفیل نے اس گھر کو منہدم کرنے کا ارادہ کر لیا جس کی تفصیلات سورت الفیل میں گزر گئی ہیں' اللہ نے اس گھر کے امن کی حفاظت فرمائی اور اس کے احترام کو بحال رکھا جبکہ اس کے ماحول میں لوگوں کی حالت یہ تھی۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (۲۹ : ۶۷) "کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ایک ایسا حرم بنایا ہے جو امن کی جگہ ہے' جبکہ لوگوں کو اس کے گرد و پیش سے اچک لیا

جاتا ہے"۔جب فیل کا واقعہ ہوا تو عربوں کے دلوں میں بیت اللہ کا احترام بڑھ گیا۔اور اس بات کا پورے جزیرۃ العرب میں غلغلہ ہو گیا۔اسی طرح اس واقعہ کی وجہ سے اہل مکہ اور بیت اللہ کے مجاوروں کا احترام بڑھ گیا اور اس وجہ سے وہ نہایت امن و امان کے ساتھ پورے عرب میں چلتے پھرتے۔اور یہ جہاں بھی ٹھہرتے لوگ ان کی رعایت اور احترام کرتے۔اس کے نتیجے میں انہوں نے قافلوں کے لیے دو عمومی راستے بنا لیے۔یہ راستے مکہ سے شمال کی طرف شام تک جاتے اور مکہ سے جنوب کی طرف یمن تک جاتے' اہل مکہ نے دو تجارتی سفر بھی منظم کر لیے۔ سردیوں کے موسم میں وہ یمن کے سفر پر جاتے اور گرمیوں کے موسم میں یہ شام کی طرف نکل جاتے۔

باوجود اس امر کے جزیرۃ العرب کے اطراف و اکناف میں امن و امان کی حالت کچھ اچھی نہ تھی' ڈاکے اور لوٹ مار ہر طرف عام تھے' لیکن بیت اللہ کے احترام کی وجہ سے قریش کے یہ تجارتی سفر پر امن رہتے اور یہ قریش کی ایک ممتاز خصوصیت ہو گئی تھی۔اور اس وجہ سے ان کے سامنے رزق کے وسیع ذرائع کھل گئے تھے۔اور وہ نہایت اطمینان سے اور امن و سلامتی سے یہ تجارتی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔چنانچہ قریش ان مفید اور نفع بخش سفروں کے عادی ہو گئے تھے۔اور وہ ان کے بغیر چین سے نہ بیٹھتے تھے۔

جس طرح بعثت نبویؐ کے بعد واقعہ فیل کو بطور احسان ان کے سامنے پیش کیا گیا' اس طرح اس سورت میں بتایا گیا کہ یہ بھی اللہ کا احسان ہے کہ تم سردیوں اور گرمیوں کے سفر کے عادی ہو گئے ہو' اور ان سفروں سے تمہیں بہت تجارتی نفع ہوتا ہے۔ان کا علاقہ بنجر اور خشک ہے اور وہ اس کے اندر نہایت ہی خوش گوار اور خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔یہ اللہ کا فضل ہے اور اس فضل و کرم ہی کی وجہ سے وہ خوف سے مامون ہیں۔چاہے وہ بیت اللہ کے جوار میں اپنے گھروں میں ہوں یا وہ اپنے سفر میں ہوں' اس گھر کے احترام کی وجہ سے وہ ہر قسم کی زیادتی اور ظلم سے محفوظ ہیں۔

اللہ اپنا یہ احسان ان کو یاد دلاتا ہے کہ وہ حیا کریں اور اس گھر میں اللہ کے سوا' اس کے اور شریکوں اور بتوں کی بندگی نہ کریں کیونکہ یہ گھر اس کا ہے' وہی رب ہے اور اسی نے اس گھر کو امن دیا ہے جس کے اندر وہ مزے سے رہتے ہیں' اس گھر کے نام سے ان کے سفر محفوظ ہیں اور سفروں سے یہ صحیح سالم گھروں کو لوٹتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔قریش چونکہ گرمیوں اور سردیوں کے سفر کے عادی ہو گئے ہیں تو انہیں چاہئے کہ صرف اس گھر کے رب کی بندگی کریں جس نے ان سفروں کے دوران ان کے امن و امان کا بندوبست کیا اور انہیں اس سفر کا عادی بنایا جس کی وجہ سے انہیں مالی مفادات ملتے ہیں۔

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ (۳) الَّذِىْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ (۱۰۶ : ۴) "لہٰذا ان کو چاہئے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا"۔ان کی زمین کی پیداوار کی جو حیثیت ہے' اس کے مطابق ان کی حالت تو یہ ہونی چاہئے تھی کہ وہ بھوک سے مرتے' لیکن اللہ نے ان کے لیے کھانے پینے کا بندوبست فراوانی سے کیا اور وہ پیٹ بھر کر کھانے لگے۔

وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (۱۰۶ : ۴) "اور خوف سے بچا کر انہیں امن دیا"۔ان کی جو جنگی قوت تھی' ان کے اردگرد جو سوسائٹی تھی' اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ ہر وقت خائف رہتے لیکن اللہ نے ان کا یہ خوف امن سے بدل دیا۔

یہ ایک ایسی یاد دہانی ہے جس کی وجہ سے انسان کے اندر حیا پیدا ہوتی ہے' وہ شرمندہ ہوتا ہے اور اپنے رویے پر نظر ثانی کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ قریش یہ بات جانتے تھے کہ اس گھر کی اہمیت کیا ہے اور اس گھر کے احترام کی وجہ سے ان کی زندگی پر جو اثرات تھے وہ ان سے بھی بے خبر نہ تھے۔ اور یہ بات بھی اپنی جگہ تھی کہ انتہائی شدید اور کربناک حالات میں وہ صرف اس گھر کے رب ہی کو پکارتے تھے۔ مثلاً دیکھئے کہ عبدالمطلب ابرہہ کا مقابلہ فوج سے نہیں کرتے اور نہ اس کی قوت کے مقابلے میں مادی قوت فراہم کرتے ہیں۔ وہ اس گھر کے رب سے خطاب کرتے ہیں' جو اس کا حقیقی متولی اور حامی تھا۔ اس موقعہ پر عبدالمطلب نے نہ کسی بت کی طرف توجہ کی اور نہ کسی معبود کی طرف اور نہ انہوں نے ابرہہ سے یہ کہا کہ اس گھر کے بہت سے الٰہ ہیں وہ اس کی حمایت کریں گے۔ بلکہ انہوں نے یہ کہا "میں تو اونٹوں کا مالک ہوں اور اس گھر کا ایک مالک ہے' وہ خود اس کی حفاظت کرے گا"۔ لیکن جاہلیت پر کبھی منطق اور حقیقت کا اثر نہیں ہوا کرتا۔ اور نہ جاہلیت حق کو تسلیم کرتی ہے اور نہ وہ معقول بات کی طرف لوٹتی ہے۔

یہ سورت' اپنے موضوع اور فضا کے اعتبار سے سورت فیل کا تسلسل ہے۔ اگرچہ یہ مستقل سورت ہے اور دونوں کے درمیان مصاحف میں بسم اللہ الرحمان الرحیم درج ہے۔ قرآن کی ترتیب نزولی سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ الفیل اور سورہ القریش کے درمیان ۹ سورتیں نازل ہوئیں' لیکن مصحف میں ان کو ایک دوسرے کے ساتھ اس لیے پیوست کیا گیا ہے کہ اس میں موضوع و مضمون کی ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۂ الماعون ۔ ۱۰۷

۱-- تا-- ۷

سورۂ الماعون ایک نظر میں

بعض روایات کے مطابق یہ سورت مکی ہے اور بعض کے مطابق مکی اور مدنی ہے ۔ (پہلی تین آیات مکی ہیں اور باقی مدنی ہیں) میرے خیال میں یہ راجح بات ہے ۔ اگرچہ مضمون کے اعتبار سے سورت ایک ہی یونٹ ہے ۔ اس کا روئے سخن بھی ایک ہی طرف ہے اور اس میں اسلامی نظریہ حیات کا ایک عمومی اصول بیان کیا گیا ہے ۔ اسلامی نظریہ حیات کا یہی اصول ہے جو ہمیں آمادہ کرتا ہے کہ ہم اس سورت کو مدنی سمجھیں ۔ کیونکہ اس میں جو اصول بیان ہوا ہے وہ مدنی موضوعات میں سے ہے ۔ یعنی نفاق اور ریاکاری سے اجتناب یا درہے کہ جن روایات میں آیا ہے کہ یہ مکی ہے ۔ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ہم اس کی آخری چار آیات کو مدنی نہ تصور کریں ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی ہوں اور مضمون اور موضوع کی مناسبت سے ان کو ان کے ساتھ ملا دیا گیا ہو ۔ نزول کے بارے میں اس قدر کافی ہے ۔ اب ہم موضوع مضمون کی طرف آتے ہیں اور اس عظیم حقیقت پر بات کرتے ہیں جو اس میں بیان کی گئی ہے ۔

---ooo---

درس نمبر ۳۰۷ تشریح آیات

۱-- تا-- ۷

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝١ فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝٢ وَلَا يَحُضُّ
عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝٣ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝٤ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ ۱
سَاهُوْنَ ۝٥ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝٦ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝٧ ع ۷

۳۲

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔ پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں' جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں"۔

یہ چھوٹی سی سورت جو صرف سات آیات پر مشتمل ہے اور آیات بھی چھوٹی چھوٹی ہیں' ایک عظیم حقیقت پر مشتمل ہے۔ اس کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ یہ گویا شعائر اسلام کو بدل کر رکھ دیتی ہے اور اس پر غور کرنے سے انسان کو ایمان و کفر کا مفہوم مکمل طور پر بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سے آگے یہ سورت ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کا مزاج کیا ہے۔ اور اس میں انسانیت کے لیے کس قدر عظیم خیر اور بھلائی پوشیدہ ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کے لیے اپنا آخری مشن بھیج کر اللہ نے اس پر کتنا عظیم رحم کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دین چند ظاہری رسوم عبادات اور دینی شعائر ہی کا نام نہیں ہے۔ اس میں دینی مراسم اور شعائر اور عبادات اس وقت تک مفید نہیں ہوتے جب تک ان میں خلوص نہ ہوئے اور ان کی ادائیگی صرف رضائے الٰہی کے لیے نہ ہو۔ اور جب ان کی وجہ سے قلب انسانی میں ایسے آثار پیدا نہ ہوں جو انسان کو عمل صالح پر ابھارتے ہیں اور جب تک یہ آثار ایسا طرز عمل اختیار نہ کریں جن کے ذریعہ انسانی زندگی اصلاح آخرت پذیر ہو۔ اور اس دنیا میں بھی ان

کے نتیجے میں اصلاح اور ترقی نہ ہو۔

پھر یہ دین چند متفرق اجزاء اور ٹکڑوں میں بٹا ہوا دین نہیں ہے کہ انسان ان میں سے جس جزء کو چاہے' لے کر نکل جائے اور جس جزء کو چاہے ترک کر دے۔ یہ ایک مکمل نظام زندگی ہے اور منہاج حیات ہے۔ اس کے مراسم عبودیت اور اس کے شعائر باہم پیوست ہیں' اس کے انفرادی فرائض اور اجتماعی احکام باہم مربوط اور معاون ہیں۔ اس کے تمام اجزاء کا مقصد ایک ہے اور وہ انسانیت کے ساتھ متعلق ہیں' یہ کہ انسانیت کو قلبی اور روحانی تطہیر نصیب ہو۔ ان کی زندگی سنور جائے۔ لوگ باہم معاون ہوں' ایک دوسرے کے کفیل ہوں' اور بھلائی' ترقی اور اصلاحات کی راہ میں ہمقدم ہوں۔ اور ان کی زندگی اللہ کی رحمتوں کا نمونہ ہو۔

انسان اپنی زبان سے کہتا ہے کہ میں مسلم ہوں' وہ مسلمان ہے اور دین اسلام کے تمام احکام اور فیصلوں کو قبول کرتا ہے' وہ نماز پڑھتا ہے' نماز کے علاوہ دوسرے مراسم عبودیت بھی سرانجام دیتا ہے' لیکن اس کے باوجود حقیقت ایمان اور دین وایمان کی تصدیق اس سے کوسوں دور ہوتی ہے۔ اس لیے کہ حقیقت ایمان کے کچھ آثار ہوتے ہیں' یہ آثار بتاتے ہیں کہ ایمان کی حقیقت موجود ہے۔ جب یہ آثار نہ ہوں تو کوئی کس طرح کہہ سکتا ہے کہ ایمان کی حقیقت موجود ہے۔ اگر آثار نہ ہوں تو محض اقرار ایمان ہے اور چند ظاہری مراسم عبودیت ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب ایمان کی حقیقت کسی دل میں پوری طرح بیٹھ جائے تو وہ فوراً عمل صالح کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے سورہ العصر میں تفصیلات دی ہیں۔ اگر کسی کا ایمان اس اسلوب سے متحرک نہیں ہوتا تو ظاہری علامت تو یہ ہوگی کہ ایمان اصلا موجود ہی نہیں ہے۔ یہ وہ عظیم حقیقت ہے جس کو یہ سورت ایک مکمل قرار داد کی شکل میں پیش کرتی ہے۔

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (۱) فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ (۲) وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۳) (۱۰۷: ۱ تا ۳) "کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں اکساتا"۔ آغاز ایک ایسے سوال سے ہوتا ہے کہ تمام لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں تاکہ ایسے شخص کی بابت علم حاصل کر سکیں کہ کون ہے وہ شخص جو دین کی تکذیب کرتا ہے اور اس بات کی صراحت قرآن مجید کر رہا ہے کہ ایسا شخص مکذب دین ہے۔ چنانچہ جواب آتا ہے۔

فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ (۲) وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۳) (۱۰۷: ۲ تا ۳) "وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں اکساتا"۔

ایمان اور دین کی جو روایتی تعریف ہے اس کو دیکھتے ہوئے قرآن کی یہ صراحت بادی النظر میں انوکھی معلوم ہو سکتی ہے' لیکن یہ اصل حقیقت ہے کہ جو شخص یتیم کو دھکے دیتا ہے وہ دراصل دین کی تکذیب کرتا ہے۔ یتیم کو دھکے دینے کا مطلب اسے ایذا دینا اور اس کی توہین کرنا ہے۔ اور

وَلَا يَحُضُّ (۱۰۷: ۳) کے معنی یہ ہیں کہ وہ دوسرے لوگوں کو اس کام پر نہیں اکساتا اور مسکینوں کا

خیال نہیں رکھتا۔ اگر اس نے صداقت کے ساتھ دین اسلام کو قبول کیا ہوتا اور اس کے دل میں حقیقی تصدیق ہوتی تو وہ یتیم کو دھکے نہ دیتا' اور مساکین کو کھانے کے لیے اکسانے اور تحریک چلانے پر لوگوں کو آمادہ کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ دین کا اقرار اور تصدیق صرف زبانی فعل نہیں ہے بلکہ وہ ایک ذہنی اور قلبی انقلاب ہے جس کے نتیجے میں انسان خود بخود بنی نوع انسان پر رحم اور نیکی کرنے لگتا ہے۔ ان لوگوں پر جو لداد اور مراعات کے مستحق ہوں۔ اللہ کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ لوگ اپنی زبان سے محض چند کلمے چبتے جائیں۔ ان کلمات کے ساتھ ساتھ اللہ کا مطالبہ کچھ اعمال کا بھی ہے جو یہ تصدیق کریں کہ ایمان موجود ہے' ورنہ ایمان محض ایک ہوائی ذرہ ہو گا جو فضا میں ادھر ادھر اڑتا رہتا ہے۔

ان تین آیات میں اس حقیقت کو جس طرح نہایت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے اس کی مثال پورے قرآن میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ اسلامی نظریہ حیات کی روح ہے اور اس دین کا یہ مزاج ہے۔

ہم یہاں اسلام اور ایمان کی فقہی تعریفات اور ان کے حدود و قیود کے مباحث اور اختلافات میں داخل ہونا نہیں چاہتے۔ یہ تعریفات اس لیے کی جاتی ہیں کہ ان پر شرعی اور قانونی حقوق و فرائض کا فیصلہ کیا جا سکے۔ اس سورت میں جو بات کہی گئی ہے وہ اس حقیقت نفس الامری کا اظہار کرتی ہے جو اللہ کے ہاں معتبر ہے اور جو اللہ کے معیار کے مطابق ناپی تولی جاتی ہے۔ اللہ کے ہاں جو حقائق ہوتے ہیں وہ ان حقائق سے الگ ہوتے ہیں جن کے مطابق شرعی اور قانونی معاملات طے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس حقیقت اور اس اصول کے مطابق بعض عملی صورتوں کا ذکر کیا جاتا ہے :

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ (٤) الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (٥) الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاۗءُوْنَ (٦) وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (٧) (۱۰۷ : ٤ تا ٧) ''پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں' جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں''۔ یہ ان لوگوں کے لیے بد دعا ہے یا دھمکی۔ ان لوگوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ وہ لوگ جو ریاکاری کرتے ہیں اور جو معمولی ضرورت کی چیزیں بھی دوسروں کو نہیں دیتے۔

یہ لوگ نماز تو پڑھتے ہیں مگر نماز کو قائم نہیں کرتے' یہ نماز کی حرکات تو پوری کرتے ہیں۔ اس کے اندر پڑھی جانے والی دعائیں بھی پڑھتے ہیں' لیکن ان کا دل و دماغ نماز کے اندر نہیں ہوتا۔ ان کی روح نماز کی حقیقت سے بیگانہ ہوتی ہے۔ ان کی سوچ ان معانی سے دور ہوتی جو وہ پڑھتے ہیں۔ جو قرات' جو دعائیں اور جو ثنائیں وہ پڑھتے ہیں اس سے ان کی روح دور ہوتی ہے' گویا وہ اپنی نماز سے جسے وہ پڑھ رہے ہوں' غافل ہوتے ہیں۔ اسے صحیح طرح ادا نہیں کرتے۔ اللہ کے ہاں مطلوب یہ ہے کہ نماز کو صحیح طرح قائم کیا جائے۔ فقط ادائیگی مطلوب نہیں ہے اور نماز قائم تب ہوتی ہے کہ اسے دینی روح اور اس کے معانی کے ساتھ پڑھا جائے اور جس میں اللہ کی ذات مستحضر ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جس نماز کو وہ پڑھ رہے ہوتے ہیں ان کی زندگی میں اس نماز کے آثار پیدا نہیں ہوتے کیونکہ وہ نماز کی حرکات کے دوران غافل ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ معمولی ضرورت کی چیز (ماعون) بھی دوسروں کو نہیں دیتے۔ دوسروں کے ساتھ کوئی امداد نیکی' بھلائی نہیں کرتے۔ حالانکہ نماز کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نماز سے اللہ کے بندوں کے ساتھ بھلائی کرے اور ان سے معمولی ضرورت کی چیز نہ روکے۔ اس لیے جو لوگ اس قسم کے ہوتے ہیں وہ دراصل حقیقی نماز

نہیں ادا کر رہے ہوتے ۔ لہٰذا اللہ کے نزدیک حقیقی اور سچی عبادت کا معیار یہ ہے کہ ایک انسان اپنے بنی نوع انسان سے معمولی ضرورت کی اشیاء نہ روکے ۔ ان کی معاونت سے دستکش نہ ہو ۔

یوں ہم دین کی ایک دوسری لائیفک حقیقت کو سامنے اپنے آپ کو کھڑا پاتے ہیں اور یہ اسلامی نظریہ حیات کا تقاضا ہے وہ یہ کہ ایک قرآنی آیت نمازیوں کو کھلی دھمکی دے رہی ہے کہ وہ ہلاکت سے دوچار ہوں گے کیونکہ وہ نماز کو صحیح طرح قائم نہیں کر رہے ۔ بلکہ وہ ایسی حرکات کر رہے ہیں جن میں کوئی روح نہیں ہے ۔ وہ ان حرکات میں اللہ کے دربار میں حاضر نہیں ہوتے ۔ خالص اللہ کے نہیں ہوتے ' بلکہ محض لوگوں کو دکھاوے کے لیے وہ نماز پڑھتے ہیں ' اس لیے ان کی نماز سے وہ آثار نمودار نہیں ہوتے جو حقیقی نماز سے ہوتے ہیں ' نہ ان کے دل پر نماز کا اثر ہوتا ہے ' نہ ان کی عملی دنیا پر وہ اثر انداز ہوتی ہے ۔ لہٰذا یہ نماز ذرہ بے قیمت ہے ' ایک غبار ہے بلکہ نمازی کے لیے یہ نماز ایک وبال و ہلاکت ہے ۔

ان تصریحات کے بعد ہماری سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آجاتی ہے کہ اللہ لوگوں کے پاس رسول کیوں بھیجتا ہے اور لوگوں سے کیوں مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ ایمان لائیں اور بندگی کریں ؟ --- اس ساری جدوجہد سے اللہ کا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے ۔ وہ تو غنی بادشاہ ہے ۔ اس لیے مقصود یہ ہے کہ خود انسانوں کی زندگی سنور جائے ان کی بھلائی مقصود ہے ۔ ان کے قلوب پاک ہوں اور زندگی کامیاب ہو ' وہ ان کے لیے ایک ایسی زندگی چاہتا ہے جو پاکیزہ شعور اور اعلیٰ نظریات پر قائم ہو ۔ جس کے اندر لوگ ایک دوسرے سے کفیل ہوں جن کی ذہنیت شریفانہ ہو ' جن کے اندر محبت اور بھائی چارہ ہو ' جن کا تصور اور طرز عمل دونوں پاک ہوں ۔

اے کاش ! انسانیت اس بھلائی کو چھوڑ کر کدھر جا رہی ہے ۔ اس رحمت کو چھوڑ کر کہاں بھٹک رہی ہے اور اس خوبصورت اور حسین و جمیل مقام بلند کو چھوڑ کر کن پستیوں میں گری ہوتی ہے یا کہاں وہ جاہلیت کے پیچیدہ اور تاریک راہوں میں گم گشتہ ہے حالانکہ اس کے سامنے نور ' اسلام کا نور ' مرکزی چوک میں موجود ہے ۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۂ الکوثر ۔ ۱۰۸

۱-- تا-- ۳

سورۂ الکوثر ایک نظر میں

یہ سورت خالص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے متعلق ہے جس طرح سورت الضحیٰ اور سورہ الشرح آپؐ کے لیے تھی ۔ یہ سورہ آپؐ کا غبار خاطر دور کرتی ہے اور یہ پیشن گوئی کرتی ہے کہ آپؐ کو خیر کثیر دیا گیا ہے اور آپؐ کے دشمنوں کو اس میں دھمکی دی گئی ہے کہ انکی جڑ کاٹ دی گئی ہے ' لہٰذا آپ کو چاہئے کہ اپنے رب کا شکر ادا کریں۔

چنانچہ یہ سورت ابتدائی دور میں دعوت اور داعی کی زندگی کی ایک جھلک ریکارڈ کرتی ہے 'جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہر طرف سے سازشیں کی جا رہی ہیں اور آپؐ کو اذیت دی جا رہی ہے اور آپؐ کی دعوت کا راستہ روکا جا رہا ہے اور اس دور میں اللہ اپنے بندے پر جس طرح مہربان اور لال ایمان کے مٹھی بھر دستے پر جس طرح مہربان تھا اس کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے ۔ چنانچہ اس سورت میں آپؐ کو اطمینان دلایا جاتا ہے ' اور آپؐ سے روشن مستقبل کا وعدہ کیا جاتا ہے اور آپؐ کے دشمن کے بارے میں تاریک مستقبل کی پیشن گوئی کی جاتی ہے کہ ان کی جڑ کٹنے والی ہے ۔

وہ ہدایت ' خیر اور ایمان کی حقیقت کو ایک طرف رکھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں کثرت ' برکت اور دوام اور پھیلاؤ ہے ۔ اور دوسری جانب گمراہی ' شرک اور کفر کو رکھا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ان کی قسمت میں قلت ' خسارہ اور جڑ کٹنا لکھا ہوا ہے ۔ اگرچہ غافل لوگ اس کے برعکس سوچتے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۳۰۸ تشریح آیات

۱-- تا-- ۳

۱
۳ع اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝۱ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝۲ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳ ع
۳۳

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"(اے نبیؐ) ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دیا پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو، تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے"۔

روایات میں آتا ہے کہ قریش کے اوباش رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہروقت پیچھا کرتے تھے۔ آپؐ کی دعوت کے خلاف سازشوں میں لگے رہتے تھے اور آپؐ کے ساتھ طنز و مزاح کرتے رہتے تھے۔ اس طرح وہ بزعم خود عوام الناس کو آپؐ کی دعوت حق سننے سے باز رکھتے تھے جو آپؐ لے کر آئے تھے۔ ان اوباشوں کے سرخیل عاص ابن وائل، عقبہ ابن ابو معیط، ابولہب، ابوجہل وغیرہ تھے۔ یہ کہتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم "ابتر" ہیں، یعنی ان کی نرینہ اولاد نہیں ہے۔ ان میں سے بعض نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ اسے چھوڑ دو، اس کی کوئی اولاد نہیں ہے، جب یہ مرجائے گا تو یہ تحریک خود بخود ختم ہوگی۔

عرب معاشرے میں چونکہ نرینہ اولاد کی بہت بڑی اہمیت تھی، اس لیے ان کے ہاں پروپیگنڈے کی اس سازش کا کافی اثر تھا۔ آپؐ کے مخالف اور دشمن اس گھٹیا پروپیگنڈے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور آپؐ کے قلب مبارک پر اس کا بہرحال اثر ہوتا تھا۔ اس وجہ سے یہ سورت نازل ہوئی کہ آپؐ کا غبار خاطر چھٹ جائے۔ آپؐ خوشی اور تازگی محسوس کریں اور آپؐ کو جو خیر کثیر دے کر بھیجا گیا تھا، اس کی حقیقت اچھی طرح دلوں میں بیٹھ جائے، اور یہ سمجھا دیا جائے کہ دراصل "ابتر" تو آپؐ کے دشمن ہیں اور وہ اس انجام تک پہنچنے والے ہیں کہ ان کی جڑ کٹ جائے اور ان کا نام و نشان مٹ جائے۔

اِنَّآ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ (۱۰۸ : ۱) ”ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دیا ہے“۔ کوثر کثرت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بے حد و حساب اور یہ مفہوم اس کے بالکل برعکس ہے جس کو ہر احمق آپ کی طرف منسوب کرتا تھا یعنی ہم نے آپ کو جو کچھ دیا ہے وہ ایک عظیم اور لامحدود فیض ہے۔ یہ مسلسل جاری رہے گا اور اس کا سلسلہ کٹنے والا نہیں ہے۔ جو شخص بھی غور کرے کہ وہ فیض کثیر کیا ہے' جو اللہ نے اپنے نبی کو دیا تو وہ اسے پا سکتا ہے جس طرف بھی وہ نگاہ کرے اسے موجود پائے گا۔

سب سے پہلے آپ کو جو منصب رسالت دیا گیا وہ خیر کثیر ہے' آپ کا عظیم سچائی سے رابطہ قائم ہوا۔ اس عظیم وجود سے آپ کا رابطہ ہو گیا جس کے سوا کوئی موجود نہیں ہے یعنی ذات باری سے اور جس شخص کا تعلق ذات باری سے قائم ہو جائے وہ سب کچھ پا لیتا ہے۔

پھر یہ خیر کثیر اس قرآن کی شکل میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ پورا قرآن نہیں' اس کی ایک ایک سورت خیر کثیر ہے اور ہر سورت ایک ایسا سرچشمہ ہے جس کے فیوض ختم نہیں ہوتے۔

پھر پورا عالم بالا آپ پر درود و سلام بھیجتا ہے اور ان لوگوں پر بھی درود و سلام بھیجتا ہے جو آپ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ اس طرح آپ کا اسم مبارک اس پوری کائنات میں اللہ کے نام کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔

پھر آپ کی سنت کی صورت میں بھی خیر کثیر موجود ہے اور یہ سنت اس جہاں کے اطراف و اکناف میں زندۂ جاوید ہے۔ لاکھوں کروڑوں لوگ آپ کی سنت پر چل رہے ہیں' لاکھوں کروڑوں لوگ آپ کے پروانے ہیں اور قیامت تک کروڑوں انسان آپ پر درود و سلام بھیجتے رہیں گے۔

پھر یہ کوثر اس خیر کثیر کی شکل میں بھی موجود ہے جس سے یہ پوری دنیا فیض یاب ہوئی اور پوری انسانی تاریخ میں یہ فیوض جاری ہیں۔ چاہے ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو' چاہے وہ ایمان لائیں یا نہ لائیں۔ لیکن اس سرچشمے کے اثرات ان پر پڑے اور کسی نہ کسی طرح وہ فیض یاب ہوئے۔

غرض یہ کوثر وہ خیر کثیر اور عظیم ہے جس کا شمار ممکن نہیں ہے۔ اور ہم اپنی کم مائیگی کے ساتھ اگر اس کا شمار کریں تو ہم اس کی قدر و قیمت کو کم ہی کر دیں گے۔

یہ درحقیقت ایک کوثر ہے اور اس کے فیوض کی انتہا نہیں ہے۔ اسی کے علوم و معارف کے لیے حدود و قیود نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اسے کوثر کہہ کر مجمل چھوڑ دیا اور ہر ”خیر“ اس کے دائرے میں آ جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ خیر۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ کوثر ایک نہر ہے جو جنت میں ہے۔ اور یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے تو حضرت ابن عباسؓ نے اس بارے میں کہا کہ وہ نہر بھی منجملہ اس خیر کثیر میں سے ہے جو آپ کو دی گئی ہے۔ گویا یہ کوثر الکوثر کا ایک حصہ ہے۔ یہ نہایت ہی مناسب تطبیق ہے جو اس بارے میں کی جا سکتی ہے۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (۱۰۸ : ۲) ”پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو“۔ اس خیر کثیر کے موکد تذکرے کے بعد' جو مکہ میں تحریک اسلامی کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈا کرنے والوں اور دعوت اسلامی کے

خلاف سازشیں کرنے والوں کے علی الرغم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپؐ اس خیر کثیر کے عطا کیے جانے پر اللہ کا شکر ادا کریں اور اللہ کا پہلا شکر یہ ہے کہ انسان بندگی میں اور تمام تقربات میں صرف اللہ وحدہ لاشریک کی طرف متوجہ ہو' اور صرف اسی کو یاد کرے۔ نماز میں بھی اور قربانی میں بھی۔ نماز بھی خالص اللہ کے لیے ہو اور قربانی بھی خالص اللہ کے لیے ہو۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (۱۰۸ : ۲) "یعنی اللہ ہی کے لیے نماز پڑھو اور اللہ ہی کے نام کی قربانی کرو" اور شرک کرنے والوں کے شرک کی کوئی پرواہ نہ کرو' اور اللہ کی بندگی کرو اور ان کے ساتھ شریک ہو کر کسی اور کی بندگی نہ کرو' اور اللہ کی قربانی میں اللہ کے سوا کسی اور کا نام نہ لو۔

قرآن کریم بار بار اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ تمام ذبیحوں پر صرف اللہ کا نام لو' اور یہ کہ جن ذبیحوں پر غیراللہ کا نام لیا گیا ہو' وہ حرام ہیں اور ان کا کھانا حرام ہے اور جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو' ان کا کھانا بھی حرام ہے۔ یہ اس لیے کہ قرآن کریم انسانی زندگی کو ہر قسم کے شرک کے آثار اور شائبوں سے پاک کرنا چاہتا ہے۔ صرف عقیدے سے شرک کو پاک کرنا مقصود اسلام نہیں ہے بلکہ قرآن انسان کی پوری زندگی سے شرک کی نفی کرتا ہے شرک کے تمام معانی اور تمام مفاہیم کے اعتبار سے اس کی نفی کرتا ہے' اس لیے کہ یہ دین وحدت اور توحید کا دین ہے۔ اور اس کی توحید کا نظریہ ہر پہلو سے مکمل ہے۔ اس لیے یہ دین آخر دم تک شرک کا پیچھا کرتا ہے اور اس کے تمام مظاہر سے اس کے نشان مٹاتا ہے۔ قرآن کریم اتنے دور تک شرک کا پیچھا کرتا ہے کہ اسے کسی کمین گاہ میں دم لینے نہیں دیتا۔ انسانی نفسیات' انسانی ضمیر اور انسانی فکر سے اس کا صفایا کرتا ہے۔ اسلامی عبادات سے اسے مٹاتا ہے۔ انسانی زندگی کے رسم و رواج سے اسے دور کرتا ہے اس لیے کہ زندگی ایک باہم پیوست کل (ایک نظام) ہے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے اور حصے بخرے نہیں کیے جا سکتے۔ اس لیے اسلام پوری انسانی زندگی سے شرک کے اثرات کو ختم کرتا ہے اور پوری زندگی کا رخ اللہ وحدہ کی طرف پھیر دیتا ہے۔ اور اسے پوری طرح واضح' صاف اور ستھرا بناتا ہے' چاہے قربانیوں اور ذبیحوں کا مسئلہ ہو یا عبادات و عقائد کا ہو یا رسوم و تقالید کا۔

انَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (۱۰۸ : ۳) "تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے"۔ پہلی آیت کا فیصلہ یہ تھا کہ آپؐ کی جڑ نہیں کٹی بلکہ آپ تو الکوثر کے مالک ہیں' اور اس آیت میں شکاری اپنے جال میں پھنس جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابتر نہیں بلکہ آپؐ کے دشمنوں کی جڑ کٹ چکی ہے اور جو لوگ آپ کو ناپسند کرتے ہیں ان کا نام و نشان مٹ جانے والا ہے۔

اور اللہ کی یہ دھمکی سچی ثابت ہوئی' ان لوگوں کا نام و نشان مٹ گیا۔ اس دنیا سے ان کا تذکرہ ہی ختم ہو گیا جبکہ حضرت محمدؐ کا نام بلند ہوا اور آپؐ کے مراتب پڑھتے ہی رہے۔ آج ڈیڑھ ہزار سال کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ اس آیت میں کی گئی پیشن گوئی سچی ثابت ہو چکی ہے۔ اور اس آیت کا مصداق آج ایک واضح شکل میں ہمارے سامنے ہے جو ان لوگوں کے سامنے اس قدر واضح نہ تھا جنہوں نے ان آیات کو پہلی مرتبہ سنا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان' سچائی اور بھلائی کی جڑ کبھی نہیں کٹ سکتی۔ ان چیزوں کی جڑیں تو زمین میں گہری ہوتی ہیں۔

اور شاخیں آسمانوں کی فضا میں دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں بلکہ کفر' باطل اور شر کی جڑ کٹی ہوئی ہوتی ہے ۔ اگرچہ وہ بظاہر تروتازہ اور پھلا پھولا نظر آئے ۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ کا معیار انسانوں کے معیار سے مختلف ہے ۔ انسانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ دھوکہ کھا جاتے ہیں ۔ فریب میں آجاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کے معیار دراصل حقائق کا تعین کرتے ہیں ۔ اس سورت میں جو مثال دی گئی ہے' یہ ہمارے لیے ایک دائمی اور لازوال مثال ہے ۔ ذرا سوچئے تو سہی' وہ لوگ کہاں ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ گھٹیا زبان استعمال کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہم نے عوام کو گمراہ کر دیا ہے اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ختم ہو گیا ہے ۔ اس کا راستہ روک لیا گیا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کہاں ہیں ۔ ان کا ذکر کہاں ہے' ان کے آثار کہاں ہیں' اس کے مقابلے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن کو وہ ابتر کہتے تھے' ان کو تو ہر پہلو سے حظ وافر دیا گیا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بات ممکن نہیں ہے کہ دعوت الی اللہ' سچائی اور بھلائی کی تحریک ختم ہو جائے اور اس کی جڑ کاٹ دی جائے ۔ اور نہ اس تحریک کے داعی ابتر ہو سکتے ہیں اس لیے کہ اس تحریک کا محرک زندۂ جاوید' باقی' لازوال اور ہمیشہ رہنے والا ہے ۔ بلکہ کفر' باطل اور شر ختم ہونے والے ہیں اور ان کے حاملین کا نشان بھی مٹنے والا ہے ۔ اگرچہ کسی مختصر دور کے لیے یہ چیزیں مستحکم اور لازوال نظر آتی ہوں اور ان کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہوں ۔ یہ ہے سچی بات جو اللہ فرماتا ہے' اور سازشی اور مکار جو کچھ کہتے تھے وہ جھوٹ تھا اور جھوٹ ہے اور ہمیشہ جھوٹ رہے گا ۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۂ الکافرون ـ ۱۰۹

۱-- تا-- ۶

سورۂ الکافرون ایک نظر میں

عرب اللہ کے منکر نہ تھے ' لیکن ان کی نظروں سے وہ اوصاف اوجھل تھے جن سے اللہ نے اپنے آپ کو متصف فرمایا تھا یعنی احد "اکیلا" اور صمد "جو کسی کا محتاج نہ ہو اور سب اس کے محتاج ہوں"۔ چنانچہ وہ کچھ دوسرے لوگوں کو اللہ کے ساتھ شریک کرتے تھے اور اللہ کی قدر اس طرح نہ کرتے تھے جس طرح اللہ کی عبادت کرنے کا حق ہے۔ وہ اللہ کے ساتھ کئی بتوں کو شریک کرتے تھے۔ یہ بت انہوں نے یا اپنے اسلاف کی طرف منسوب کر رکھے تھے یا بڑے اکابر کی طرف یا فرشتوں کی طرف۔ یاد رہے کہ یہ لوگ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے اور یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ اللہ اور جنوں کے درمیان نسب اور رشتہ ہے۔ مدت گزرنے کے بعد انہوں نے یہ نسبت بھلا دی اور ان الہوں کی بندگی شروع کر دی اور ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ان بتوں کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ان کو اللہ کے زیادہ قریب کرتے ہیں۔ سورہ زمر (۳) میں کہا گیا ہے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (۳۹ : ۳) "ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے ذریعے اللہ تک ہماری رسائی ہو جائے"۔ قرآن کریم نے ان کی یہ بات نقل کی ہے کہ وہ اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ زمین و آسمان کی تخلیق اللہ نے کی ہے اور شمس و قمر کو بھی اللہ ہی نے مسخر کیا ہے اور آسمانوں سے پانی بھی اللہ ہی اتارتا ہے۔ سورت العنکبوت (۶۱) میں ہے :

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (۲۹ : ۶۱) "اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ اور سورج اور چاند کس کے تابع فرمان ہیں تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے"۔ اور آگے اسی سورت (۶۳) میں کہا گیا ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (۲۹ : ۶۳) "اگر تم ان سے پوچھو کون ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا پھر اس سے زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے"۔

وہ جب قسمیں کھاتے تو اللہ کے نام کی کھاتے ' واللہ ' باللہ اور تاللہ اور اپنی دعاؤں کا آغاز بھی وہ اللھم سے کرتے تھے۔ لیکن اللہ پر ایمان رکھنے کے باوجود شرک نے ان کے عقائد و تصورات ' ان کے رسم و رواج ' ان کے مراسم

عبودیت کو خراب کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے مزعومہ خداؤں اور دیوتاؤں کو اپنے مویشیوں' اپنی فصلوں اور اپنی اولاد میں شریک کر لیا تھا' اور اس سلسلے میں وہ اس قدر آگے بڑھ گئے تھے کہ وہ اپنے بیٹوں کو بھی بعض اوقات بتوں پر قربان کرتے تھے۔ سورہ انعام (۱۳۶ تا ۱۴۰) میں قرآن مجید یہ صراحت کرتا ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۱۳۶) وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ (۱۳۷) وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۱۳۸) وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۱۳۹) قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (۱۴۰) (۶ : ۱۳۶ تا ۱۴۰) ”انہوں نے اللہ کے لیے خود اس کے کھیتوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کے لیے ہے' بزعم خود' اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے' پھر جو چیز ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ ان شریکوں کو پہنچ جاتا ہے' کیسے برے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ؟ اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے لہٰذا انہیں چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیوں میں لگے رہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں' حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے۔ پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی۔ اور کچھ جانور ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے' اور یہ سب کچھ انہوں نے اللہ پر افترا کیا ہے' عنقریب اللہ انہیں افترا پردازیوں کا بدلہ دے گا۔ اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے یہ ہمارے مردوں کے لیے مخصوص ہے۔ اور ہماری

عورتوں پر حرام' لیکن اگر وہ مردہ ہو تو دونوں اس کے کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ باتیں جو انہوں نے گھڑ لی ہیں۔ ان کا بدلہ اللہ انہیں دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ حکیم اور سب باتوں کی اسے خبر ہے۔ یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی کی وجہ سے قتل کیا اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اللہ پر افترا پردازی کر کے حرام ٹھہرالیا۔ یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز وہ راہ راست پانے والوں میں سے نہ تھے"۔

ان کا اعتقاد تھا کہ وہ دین ابراہیم پر ہیں۔ وہ یہ یقین بھی رکھتے تھے کہ وہ اہل کتاب سے زیادہ ہدایت پر ہیں۔ یہ اہل کتاب ان مشرکین کے ساتھ جزیرۃ العرب میں دیتے تھے کیونکہ یہودیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عزیر اللہ کے بیٹے ہیں۔ عیسائی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں اور خود یہ اہل عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ جنوں کی اللہ کے ساتھ رشتہ داری ہے' لہٰذا وہ اہل کتاب کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ ہدایت یافتہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ ملائکہ اور جنوں کی نسبت اللہ کی طرف اس عقیدے سے زیادہ قریب الفہم ہے کہ عزیر علیہ السلام یا عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ جبکہ یہ سب عقائد شرکیہ ہیں۔ اور شرک میں کوئی درجہ بھی اچھا نہیں ہے۔ البتہ وہ اہل کتاب کے مقابلہ میں اپنے عقائد کو بہتر سمجھتے تھے۔

جب آپؐ کی بعثت ہوئی اور آپؐ نے فرمایا کہ میں دین ابراہیم پر ہوں تو انہوں نے کہا جب ہم بھی دین ابراہیم پر ہیں تو ہمیں پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے باوجود ان کے ہاں ایک منصوبہ تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار کر لی جائے۔ انہوں نے آپؐ کو یہ پیشکش کی تھی کہ آپؐ ان کے معبودوں کے سامنے جھک جائیں اور وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے الٰہ کے سامنے جھک جائیں گے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے الہوں پر تنقید نہ کریں' ہم ان کے الٰہ پر تنقید نہ کریں گے۔ اس کے علاوہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں پر جو شرائط عائد کریں آپؐ کی مرضی۔

ان لوگوں کے خیالات اور تصورات چونکہ مختلف النوع تھے۔ وہ ایک طرف اللہ کی عبادت کا دم بھرتے تھے اور دوسری جانب دوسرے الہوں کے بھی پجاری تھے اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ ان کے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان زیادہ فاصلے نہیں ہیں۔ اور اتحاد ممکن ہے۔ اور کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر باہم فیصلہ ہو سکتا ہے جس میں دونوں فریقوں کی رضا پیش نظر ہو۔

اس خیال کو پوری طرح رد کر دینے کی خاطر اور اس کوشش کا راستہ پوری طرح بند کر دینے کی خاطر اور اسلامی عبادت اور مشرکانہ عبادت' اسلامی نظام اور جاہلی نظام' اسلامی عقائد اور کافرانہ عقائد اور اسلامی طرز زندگی اور کافرانہ طرز زندگی کے درمیان مکمل فرق کر دینے کی خاطر یہ دو ٹوک بات کی ضرورت تھی اس لیے یہ سورت نازل ہوئی۔ جس کے اندر یہ بات نہایت تاکیدی انداز میں مکرر سہ کرر بیان کی گئی تاکہ اس موضوع پر بات ختم ہو جائے۔ توحید اور شرک کے اتحاد کے تمام راستے بند کر دیئے جائیں اور ہر قسم کی سودا بازی کی جڑ کاٹ دی جائے اور راستے کے نشانات واضح ہو جائیں اور نہ سودا بازی ہو اور نہ بحث و مباحثہ ہو۔

---○○○---

درس نمبر ۳۰۹ تشریح آیات

۱-- تا-- ۶

اٰیَاتُهَا ٦ — سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ (۱۰۹) — مَكِّيَّةٌ (۱۸) — رُكُوْعُهَا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝۱ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ
مَاۤ اَعْبُدُ ۝۳ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝۴ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ
اَعْبُدُ ۝۵ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝۶

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"کہہ دو کہ اے کافرو، میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو، نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو، جس کی عبادت میں کرتا ہوں اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے، اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین"۔

انکار کے بعد انکار، تاکید کے بعد تاکید اور قطعیت کے بعد قطعیت۔ نفی، قطعیت اور تاکید کے تمام صیغے اور اسالیب اس سورت میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔

قُلْ "کہہ دو"۔ یہ دو ٹوک خدائی حکم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ عقیدہ اور یہ نظریہ مامور من اللہ ہے۔ یہ اللہ وحدہ کا حکم ہے اور اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ذاتی فیصلہ نہیں ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے اور اس حکم سے سرتابی نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ کوئی ایسا وجود ہے جو اللہ کے حکم کو رد کر سکے۔

قُلْ یٰاَیُّھَاالْکٰفِرُوْنَ (۱۰۹ : ۱) "کہہ دو اے کافرو"۔ اللہ نے ان کو اس لفظ سے پکارا جس کا اطلاق ان پر حقیقی معنوں میں ہوتا ہے۔ ایک ایسی صفت سے ان کو بلایا گیا جو ان کے اندر فی الواقعہ موجود ہے۔ درحقیقت وہ کسی دین کے پیرو نہ تھے اور درحقیقت وہ مومن نہ تھے، وہ کافر تھے۔ لہٰذا تمہارے اور ان کے درمیان کوئی نکتہ اشتراک نہیں ہے۔

اس طرح سورت کے آغاز ہی سے یہ اشارہ دے دیا جاتا ہے اور چھوٹتے ہی یہ بات واضح کر دی جاتی ہے کہ ایک

مسلم مومن اور کافر کے درمیان کبھی بھی اتحاد نہیں ہو سکتا۔

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (۱۰۹ : ۲) "میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو"۔ میری عبادت تمہاری عبادت سے مختلف ہے اور میرا معبود تمہارے معبود سے مختلف ہے۔

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (۱۰۹ : ۳) "نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں"۔ اس لیے کہ تمہاری عبادت میری عبادت سے مختلف ہے اور تمہارا معبود میرے معبود سے سوا ہے۔

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ (۱۰۹ : ٤) "اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم نے عبادت کی ہے"۔ یہ پہلے فقرے کی تاکید ہے لیکن یہ جملہ اسمیہ منفیہ کے ذریعے نفی ہے۔ جملہ اسمیہ منفیہ نہایت مضبوطی' دوام اور تسلسل کے مفہوم میں کسی امر کی نفی کرتا ہے۔

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (۱۰۹ : ۵) "نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں"۔ یہ دوسرے فقرے کی تاکید ہے تاکہ اس معاملے میں کوئی شک و شبہ نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر مکرر تاکیدات کے بعد شک و شبہ کی کوئی گنجائش بھی نہیں رہتی۔

اس کے بعد نہایت اجمالی طور پر ایک ہی فقرے میں دونوں گروہوں کے درمیان ایسی تفریق کر دی جاتی ہے جس میں کوئی اتحاد نہیں رہتا۔ اس قدر اختلاف پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد کوئی اتصال نہیں رہتا' دونوں کے درمیان اس قدر جدائی ہو جاتی ہے کہ جس کے بعد کوئی ملاپ متصور نہیں رہتا۔

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (۱۰۹ : ٦) "تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے"۔ میں یہاں اپنے موقف پر ڈٹا ہوں اور تم اپنے موقف پر ڈٹے ہو' دونوں کے درمیان کوئی پل نہیں ہے جس پر یہ فریق مل سکیں۔ دونوں کے درمیان مکمل جدائی ہے۔ ایک واضح امتیاز اور گہری جدائی۔

یہ مکمل جدائی ضروری بھی تھی' تاکہ کفر و اسلام کے درمیان پائے جانے والے جوہری تضاد کے خدوخال واضح تر ہو جائیں' جن کو دیکھتے ہوئے ہر کوئی سمجھ لے کہ دونوں کے درمیان مصالحت اور کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اختلاف بنیادی نظریات میں ہے۔ اصل تصور اور منہاج زندگی' دونوں میں مختلف ہے اور طرز زندگی بھی بالکل جدا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ توحید ایک مکمل نظام ہے۔ شرک ایک متضاد نظام ہے۔ ان کا باہم ملاپ ممکن ہی نہیں۔ توحید ایک ایسا نظام اور تصور ہے جو انسان کو اس پوری کائنات کے ساتھ اللہ وحدہ لاشریک کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس جہت اور سمت کا تعین کر دیتا ہے جہاں سے انسان نے اپنی پوری زندگی کے لیے ہدایات لینی ہے' عقائد بھی اور قانون بھی۔ اقدار حیات اور پیمانے بھی۔ آداب اور اخلاق بھی' غرض اس زندگی اور اس کائنات کے بارے میں مکمل فلسفہ انسان اسی جہت سے لیتا ہے اور یہ جہت جہاں سے مومن یہ سب کچھ لیتا ہے ذات باری تعالیٰ کی جہت ہے جس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں ہے۔ اس

لیے اسلامی نظام زندگی میں زندگی کے تمام معاملات اسی اصول پر قائم ہوتے ہیں اور اس نظام میں اللہ کی ذات کے ساتھ کوئی شرک نہیں ہوتا۔ اسی طرز پر زندگی چلتی ہے ۔ یہ فیصلہ کن جدائی اسلامی نقطہ نظر سے داعی کے لیے بھی ضروری ہے اور جن کو دعوت دی جارہی ہے ۔ ان کے لیے بھی ضروری ہے ۔

بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ یہ خالص اسلامی تصور حیات اور جاہلی تصور حیات آپس میں مل جاتے ہیں خصوصاً ان سوسائٹیوں میں جنہوں نے پہلے خالص اسلامی تصور کو قبول کر لیا ہوتا ہے لیکن مرور زمانہ کے ساتھ ان کے اندر انحراف پیدا ہو جاتا ہے ' اس قسم کی سوسائٹیوں کے سامنے جب خالص ایمانی دعوت پیش کی جاتی ہے اور ان کے سامنے اسلامی نظام کو سیدھے سادھے طریقے سے بغیر کسی ملاوٹ کے پیش کیا جاتا ہے تو یہ لوگ اس دعوت پر بہت سختی کرتے ہیں ۔ ان لوگوں کے مقابلے میں ان لوگوں کا رویہ زیادہ معقول ہوتا ہے جن تک کبھی اسلامی دعوت پہنچی ہی نہیں ہوتی ۔ اس لیے کہ جن سوسائٹیوں نے اسلام قبول کیا ہوتا ہے اور بعد کے ادوار میں وہ منحرف ہو چکی ہوتی ہیں ' وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتی ہیں کہ وہ بھی تو ہدایت پر ہیں حالانکہ ان کے عقائد و اعمال میں صالح کے ساتھ فاسد کی ملاوٹ ہو چکی ہوتی ہے ۔ ایسی سوسائٹیوں میں کام کرنے والے ان داعیوں کو بھی بعض اوقات دھوکہ لگ جاتا ہے جو ایسی سوسائٹیوں کے صالح جانب کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے برے پہلو کو بدلنا چاہتے ہیں اور خود ایسی سوسائٹیوں کے برے پہلو سے دھوکہ کھا جاتے ہیں اور یہ دھوکہ نہایت خطرناک ہوتا ہے ۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام ' اسلام ہے اور جاہلیت جاہلیت ہے ۔ ان کے درمیان بہت بڑا فرق ہے ۔ اصل طریق کار یہ ہے کہ لوگ جاہلیت سے پوری طرح نکل آئیں اور جاہلیت کے ہر رنگ سے پوری طرح نکل کر اسلام کی طرف ہجرت کر آئیں ۔

اس سلسلے میں پہلا قدم یہ ہوتا ہے کہ داعی مکمل شعور کے ساتھ جاہلیت سے نکل کر اسلام کی طرف آجائے ۔ اپنے تصورات اور نظریات کے لحاظ سے ' اپنے اعمال اور طریق کار کے لحاظ سے اور یہ جدائی ایسی ہو کہ ان دونوں کے درمیان کوئی مصالحت نہ ہو ' کوئی تہذیبی مصالحت نہ ہو اور جب کوئی پوری طرح جاہلیت سے نکل کر اسلام میں آجائے تو اس کے بعد پھر دونوں کے درمیان کوئی تعاون باقی نہیں رہتا ۔ پھر یہ نہیں ہوتا کہ اسلام کی گدڑی میں کسی دوسرے کلچر کے پارچے اور پیوند لگیں ' نہ کچھ لو اور کچھ دو کا اصول چلتا ہے ۔ نہ ادھر سے جھکاؤ اور ادھر سے جھکاؤ ہوتا ہے ۔ اگرچہ جاہلیت اسلام کے روپ میں آئے اور اسلام کے عنوان سے بات کرے ۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی داعی کے لیے سب سے پہلے یہ بات ضروری ہے کہ اس زاویہ سے اس کا ذہن صاف ہو ' یہ بنیادی بات ہے ۔ وہ مکمل شعور رکھتا ہو کہ وہ اس سوسائٹی سے ایک بیگانہ شخص ہے ' اس کا اپنا دین ہے اور میرا اپنا دین ہے ۔ ان کا اپنا طریقہ ہے ۔ میرا اپنا طریقہ ہے ۔ اور وہ ایک قدم بھی ایسے لوگوں کی راہ پر نہیں چل سکتا ۔ لہٰذا اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ہی راستے پر چلے اور بغیر کسی مداہنت کے وہ اپنے راستے میں اس طرح ڈٹا ہوا ہو کہ اس کا ایک قدم بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹے ۔ غرض مکمل برات کا اعلان ضروری ہے ' مکمل جدائی ضروری ہے اور صریح اور فیصلہ کن بات ضروری ہے ۔

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (۱۰۹ : ۶) ''تمہارا اپنا دین ہے اور میرا اپنا دین ہے'' ۔

آج کے داعیان حق اس بات کے محتاج ہیں اور ان کے لیے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ وہ جاہلیت جدید کے مقابلے میں اپنی مکمل برات کا اعلان کریں اور دو ٹوک اور فیصلہ کن جدائی کا اعلان کر دیں ۔ آج کے داعی اس شعور کے محتاج ہیں کہ وہ اچھی طرح جان لیں کہ دراصل وہ مکمل جاہلانہ اور کافرانہ معاشرے میں از سرنو اسلام کا اجراء و احیا چاہتے ہیں اور ان کو ایسے معاشروں سے سابقہ درپیش ہے جو پہلے صحیح مسلمان تھے ۔ ان پر ایک طویل عرصہ گزر گیا۔

فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ”ان پر بہت مدت گزر گئی اور ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر فاسق ہو گئے ہیں“۔ اس کے علاوہ کوئی درمیانی صورت نہیں ہے ۔ نہ کچھ لو اور کچھ دو کا معاملہ ہو سکتا ہے ' نہ یہ بات ہے کہ سوسائٹی تو اسلامی ہے ' چند عیوب کی اصلاح چاہئے ' کملی تو درست ہے ایک پارچہ لگنا درکار ہے ' اصل طریقہ یہ ہے کہ اسلام کی طرف اسی طرح مکمل دعوت دی جائے جس طرح آغاز اسلام میں داعی حق نے مکمل دعوت دی تھی ' جبکہ وہ ایک جاہلی سوسائٹی کو بدل رہے تھے ۔ اسلام اور جاہلیت کے درمیان مکمل جدائی اور تفریق ضروری ہے ۔ یہ ہے میرا دین ' خالص اپنے عقائد و نظریات میں ' اپنی شریعت اور قانون میں ' اپنے تصورات و افکار ہیں یہ سب اللہ سے ماخوذ ہیں ۔ اس میں شرک کا کوئی شائبہ اور آمیزہ نہیں ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو ' انسانی طرز عمل کے ہر رخ پر۔

اس فیصلہ کن جدائی کے سوا کوئی چارہ نہیں ورنہ جاہلیت کے ساتھ التباس رہے گا۔ اسلامی کلچر میں دوسرے کلچروں کی پیوند کاری ہو گی اور جو بھی تحریک چلے گی وہ کمزور اور ضعیف بنیادوں پر ہو گی ۔ اسلامی دعوت و تحریک کے لیے ضروری ہے کہ وہ جرات مندی کے ساتھ دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز میں دی جائے اور یہی طریق کار تھا داعی اول کا۔ وہ صاف صاف کہتے تھے ۔

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (۱۰۹ : ۶) ”تمہارے لیے تمہارا دین ہے ۔ میرے لئے میرا دین ہے“۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۂ النصر ۔ ۱۱۰

۱ -- تا -- ۳

سورۂ النصر ایک نظر میں

اس مختصر سورت کے دو پہلو ہیں' ایک تو یہ ہے کہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک خوشخبری ہے کہ آپؐ کو فتح نصیب ہونے والی ہے اور اس فتح کے نتیجے میں لوگ جوق در جوق آپؐ کے دین میں شامل ہوں گے جو اللہ کا دین' اس لیے جب یہ موقعہ آجائے تو آپؐ کے لیے ہدایت یہ ہے کہ پھر آپؐ اللہ کی حمد و ثنا کریں اور تسبیح و تہلیل کرتے رہیں اور اللہ سے بخشش طلب کریں۔

ایک تو یہ پہلو ہے دوسرا یہ ہے کہ یہ سورت اس دین اور اس نظام اور اس نظریہ حیات کے حقیقی مزاج کو واضح کرتی ہے کہ اسلامی نظریہ حیات انسانت کو آزادی' رفعت اور کرامت اور خلوص عطا کرتا ہے اور ایک روشن مستقبل اور ایک بلند و برتر مقام عطا کرتا ہے۔ وہ مقام جس تک وہ نہ اس نظریہ سے پہلے پہنچ سکی اور نہ بعد میں۔ اور آئندہ بھی انسانیت کو یہ رفعت صرف اسلام کی روشنی میں نصیب ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اسلامی دعوت پر لبیک کہے۔

اس سورت کے نزول کے بارے میں متعدد روایات وارد ہیں۔ ہم ان میں سے امام احمد کی روایت کو لیتے ہیں: محمد ابن عدی روایت کرتے ہیں داؤد سے' وہ شعبی سے' وہ مسروق سے' وہ کہتے ہیں: حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آخری زمانے میں۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَ اَتُوْبُ اِلَيْهِ بڑی کثرت سے پڑھتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: "میرے رب نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ تم اپنی امت میں ایک علامت پاؤ گے اور جب تم نے وہ علامت دیکھ لی تو اللہ کی تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اس سے طلب مغفرت کرو۔ بے شک وہ مغفرت کرنے والا ہے"۔ میں نے وہ علامت دیکھ لی ہے اور وہ یہ ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱) وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (۲) فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (۳) (۱۱۰: ۱ تا ۳) "جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے اور تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو' بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے"۔ (امام مسلم از طریق داؤد ابن ہند)

امام ابن کثیر کہتے ہیں اس سورت میں فتح سے مراد فتح مکہ ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب کے تمام قبائل فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے کہ فتح ہو تو وہ اسلام قبول کریں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

اپنی قوم پر غالب ہوگئے تو وہ نبی برحق ہوں گے ۔جب اللہ نے فتح مکہ نصیب کی تو تمام عرب فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہوگئے ۔ دو سال نہ گزرے تھے کہ تمام جزیرۃ العرب نے ایمان قبول کر لیا۔اور تمام قبائل عرب اقرار ایمان کرنے لگے ۔ الحمدللہ ۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں عمر ابو سلمہ کی یہ روایت نقل کی ہے ۔جب فتح مکہ ہو گیا تو تمام اقوام دوڑ کر اسلام قبول کرنے لگیں اور رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں ۔اس سے قبل تمام قبائل فتح مکہ کے انتظار میں تھے ' ان کا کہنا یہ تھا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کی قوم کو ایک دوسرے کے مقابلے میں چھوڑ دو۔اگر وہ اپنی قوم پر غالب آگئے تو وہ نبی ہیں (بخاری)

اس سورت کے ظاہری مفہوم اور عبارت کے ساتھ یہ روایت مطابقت رکھتی ہے ۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱۱۰ : ۱) "جب اللہ کی نصرت آجائے اور فتح ہو"۔ تو اس میں کسی ایسے امر کی طرف اشارہ ہے جو آنے والا ہے ۔اور اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی جاتی کہ جب یہ امر واقع ہو جائے تو آپؐ نے یہ یہ کام کرنے ہوں گے ۔

ایک دوسری روایت بھی اس موضوع پر ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے ۔اس روایت اور مذکورہ بالا روایت جس کو ہم نے اختیار کیا ہے ان کے درمیان تطبیق کوئی مشکل کام نہیں ہے ۔

امام بخاری کہتے ہیں 'کہ موسیٰ ابن اسماعیل نے بیان کیا ابو عوانہ سے ' انہوں نے ابوبشر سے ' انہوں نے سعید ابن جبیر سے ' انہوں نے ابن عباسؓ سے ۔وہ فرماتے ہیں حضرت عمر مجھے شیوخ بدر کے ساتھ اپنے ہاں بلایا کرتے تھے ۔بعض نے اس بات کو محسوس کیا کہ یہ حضرت عمرؓ کے پاس ہمارے ساتھ کیوں جاتے ہیں ۔ان کی عمر کے تو ہمارے لڑکے ہیں ' تو انہوں نے کہا کہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں تم جانتے ہو۔ایک دن حضرت عمر نے ان لوگوں کو بلایا اور مجھے بھی ان کے ساتھ بلایا۔میں سمجھ گیا کہ آج حضرت عمر نے مجھے ان لوگوں کے ساتھ اس لیے بلایا ہے کہ انہیں دکھائیں ۔ تو حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱۱۰ : ۱) کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ بعض نے کہا ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اللہ کی حمد بیان کریں 'اس سے مغفرت کی دعا کریں اس لیے کہ اس نے ہماری نصرت کی اور ہمیں فتح نصیب ہوئی اور بعض دوسرے خاموش ہوگئے اور انہوں نے کوئی بات نہ کہی ۔پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا ابن عباس تمہاری بھی یہی رائے ہے ؟ تو میں نے کہا نہیں 'تو انہوں نے فرمایا پھر تمہاری رائے کیا ہے ۔تو میں نے کہا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "اجل" کا اظہار ہے ۔اللہ نے پہلے سے آپ کو بتا دیا (کہ اس دنیا میں اب آپ کا وقت کم ہے) اللہ نے فرمایا۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱۱۰ : ۱) "جب اللہ کی مدد آگئی اور فتح ہوگئی تو یہ علامت ہے آپ کی وفات کی ۔اس لیے آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کریں اور اس سے دعائے مغفرت کریں بے شک اللہ بخشش کرنے والا ہے ۔ تو حضرت عمر ابن الخطابؓ نے فرمایا میرے علم میں بھی وہی بات ہے جو تم کہتے ہو۔ (بخاری)

یہ بات ہماری رائے کے ساتھ متضاد نہیں ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی بتائی ہوئی علامت دیکھی ہو اور یہ بات سمجھ گئے ہوں کہ ان کا فریضہ ادا ہو چکا۔ اور یہ کہ وہ عنقریب رفیق اعلیٰ کے

ساتھ ملنے والے ہیں - یہ ہے مفہوم حضرت ابن عباس کے قول کا کہ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی بات کی گئی ہے -

ہاں ایک دوسری حدیث جسے امام بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے - وہ کہتے ہیں کہ جب سورت -

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱۱۰ : ۱) نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور کہا "مجھے میری موت کی اطلاع دے دی گئی ہے" تو وہ رو پڑیں اور پھر ہنس پڑیں - اور آپؐ نے فرمایا مجھے حضورؐ نے خبر دی کہ مجھے میری موت کی اطلاع دی گئی ہے تو میں رو پڑی اور پھر حضورؐ نے فرمایا "صبر کرو تم میرے اہل و عیال میں سب سے پہلے مجھ سے ملوگی" - اس پر میں ہنس پڑی -

اس حدیث میں اس سورت کے نزول کا وقت متعین کر دیا گیا ہے - گویا یہ اس وقت نازل ہوئی جب علامت واقع ہوگئی تھی اور تمام عرب فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوگئے تھے - جب یہ سورت علامت کے مطابق نازل ہوئی تو حضورؐ نے اس بات کو سمجھ لیا کہ اب رحلت کا وقت قریب ہے - مگر ہم نے جو پہلی بات کی ہے وہ زیادہ قابل اعتماد اور مضبوط ہے - اور آیت کی ظاہری عبارت سے بھی زیادہ قریب ہے - خصوصاً اگر یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ حضرت فاطمہؓ کے ہنسنے اور رونے کی حدیث کو ایک دوسرے انداز سے بھی نقل کیا گیا ہے اور اس کو یہ ترجیح دیتے ہیں -

حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو فتح کے سال بلایا اور ان کے ساتھ سرگوشی میں کوئی بات کی تو وہ رو پڑیں - اس کے بعد آپؐ نے ان سے مزید کوئی بات کی تو وہ ہنس پڑیں - فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہؐ فوت ہوئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ سے رسول خداؐ نے کیا بات کی تھی کہ آپؓ رو پڑیں اور پھر ہنس پڑیں - انہوں نے فرمایا کہ مجھے رسول خداؐ نے یہ اطلاع دی کہ آپؐ جلد ہی فوت ہو جائیں گے تو میں رو پڑی' اس کے بعد مجھے انہوں نے یہ اطلاع دی کہ تم جنت کی عورتوں کی سردار ہوگی' ماسوائے مریم بنت عمران کے' تو میں ہنس پڑی -

یہ روایت نص قرآنی کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے - اور امام احمد کی روایت کے ساتھ بھی متفق ہے - خلاصہ یہ کہ اللہ اور رسول اللہؐ کے درمیان ایک علامت تھی اور وہ تھی -

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱۱۰ : ۱) اور جب فتح ہوگئی تو معلوم ہو گیا کہ حضورؐ کی رحلت اور رفیق اعلیٰ سے ملنے کا وقت قریب آگیا ہے - اس وقت آپؐ نے یہ بات حضرت فاطمہؓ کے گوش گزار کی جیسا کہ حضرت ام سلمہؓ نے روایت فرمائی -

ان سب روایات سے ہم ایک دائمی اور مستقل نکتہ اخذ کرتے ہیں کہ اس مختصر سورت میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ انسانیت کو ایک نہایت اعلیٰ مقام تک بلند کرنا چاہتا ہے - وہ کیا سربلندی ہے ؟

---○○○---

درس نمبر ۳۱۰ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۳

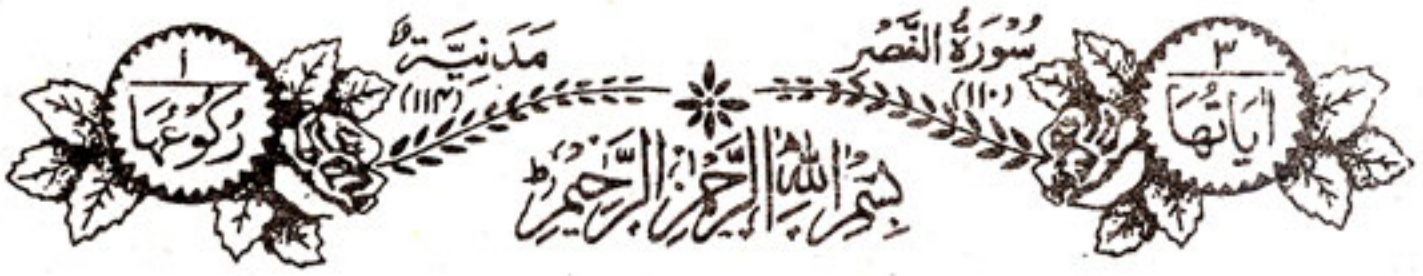

سُورَۃُ النَّصْرِ (۱۱۰) مَدَنِیَّۃٌ (۱۱۴) آیاتہا ۳ رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ﴿۱﴾ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ
اللّٰہِ اَفْوَاجًا ﴿۲﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ
تَوَّابًا ﴿۳﴾ ع

اللہ کے نام سے جو بے انتا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے اور (اے نبیؐ) تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو' اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو' بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے"۔ اس سورت کی پہلی آیت ہی میں ایک متعین اشارہ ہے' اور یہ اشارہ کائناتی واقعات کے بارے میں ایک خاص تصور پیدا کرتا ہے اور اس تصور میں یہ بتلایا جاتا ہے کہ ان واقعات میں اہل ایمان کا کردار کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار کیا ہے۔ اور انسانی زندگی اور ان کائناتی واقعات و حادثات میں اہل ایمان اور نبیؐ کے دائرہ کار کی حد کیا ہے۔ یہ اشارہ اس فقرے میں ہے۔

اذا جآء نصر اللہ (۱۱۰ : ۱) "جب اللہ کی مدد پہنچ جائے" میں ہے۔ تمام دارومدار اللہ کی نصرت پر ہے اور اللہ کا وقت مقرر ہے' جس شکل میں نصرت آئے گی وہ بھی متعین ہے' جس مقصد کے لیے یہ نصرت ہوگی وہ بھی مقرر ہے۔ نبی اور اس کے ساتھیوں کا اس کی آمد کے سلسلے میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ اور نہ ان کا نصرت الٰہیہ میں کچھ کردار ہے۔ نہ اس نصرت کے سلسلے میں ان کی ذاتی کمائی کا کوئی دخل ہے۔ نہ ان کی ذاتوں کا کوئی حصہ ہے۔ یہ نصرت ایک ایسا واقعہ ہے جو اللہ کے فیصلے کے مطابق ان کی شخصیات سے نہیں' باہر سے آتی ہے۔ ان کے لیے یہی اعزاز کافی ہے کہ اللہ یہ نصرت بظاہر ان کے ذریعہ لاتا ہے اور ان کو اس نصرت کا چوکیدار مقرر کرتا ہے اور یہ اس نصرت اور فتح کے امین

ہوتے ہیں ۔پس فتح و نصرت میں ان کا حصہ یہی ہوتا ہے کہ لوگ جوق در جوق دین اسلام میں داخل ہوتے ہیں ۔ وہ بھی اور دوسرے لوگ بھی ۔

اس اشارے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فکر کی روشنی میں ۔اس اعزاز اور تکریم کے حوالے سے جو ان کے ہاتھوں نصرت اور فتح کے ظہور کے سلسلے میں ہوا۔ رسول اللہؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کی حیثیت کا تعین ہو جاتا ہے ۔ان کی شان اور حیثیت اب یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف متوجہ ہو کر سراسر سپاس بن جائیں ۔ اللہ کی حمد و ثنا کریں اور اپنی کوتاہیوں پر مغفرت کی دعا کریں ۔ یہ حمد و ثنا اور شکر اس بات پر کہ اللہ نے ان کو اسلامی انقلاب کا امین اور نگراں بنایا اور اپنے دین کی نصرت فرما کر اور اسے غالب فرما کر پوری انسانیت پر احسان فرمایا ۔رسول اللہ فاتح ہوئے ' لوگ فوج در فوج اس خیر کثیر میں داخل ہوئے حالانکہ اس سے قبل وہ اندھے تھے 'گمراہ تھے اور سخت خسارے میں تھے ۔

استغفار کس لیے ' یہ ان نفسیاتی عوامل کے لیے ہے جو نہایت لطیف انداز میں دلوں میں داخل ہو کر بیٹھ جاتے ہیں ۔جب کوئی قوت ایک طویل اور ان تھک جدوجہد کے بعد بر سر اقتدار آتی ہے تو فتح و کامرانی کے نشے میں اس کی نفسیات میں ایک قسم کا غرور چپکے سے داخل ہو جاتا ہے 'پھر مشکلات اور قربانیوں کے بعد انسان سے خوشیوں میں کچھ کوتاہیاں بھی ہو جاتی ہیں ' ان خفیہ نفسیاتی وائرس سے صرف توبہ و استغفار کے ذریعہ بچا جا سکتا ہے 'اس لیے یہاں استغفار کا حکم دیا گیا ہے ۔

یہ استغفار اس لیے بھی ہے کہ طویل جدوجہد کے زمانے میں ان تھک حالات کے نتیجے میں شدید مشکلات اور نہایت گھرے کربناک حالات کی وجہ سے انسانی قلب میں گھٹن آ جاتی ہے ۔انسان سمجھتا ہے کہ اللہ کی نصرت کے پہنچنے میں دیر ہو گئی ہے 'اور داعی کو ہلا مارا جاتا ہے ۔ جیسا کہ بقرہ (۱۱۴) میں کہا گیا ہے ۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (۲:۲۱۴) ''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں ان حالات سے سابقہ پیش نہیں آیا جن سے تم سے پہلے اہل ایمان کو سابقہ پیش آیا تھا۔ وہ فقر و فاقہ اور شدائد و آلام سے دوچار ہوئے اور ہلا مارے گئے یہاں تک کہ رسول اور ان کے ساتھ کے اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی 'سنو اللہ کی مدد قریب ہے''۔ اس لیے حکم دیا گیا کہ استغفار کرو۔

استغفار کا حکم اس لیے بھی دیا گیا کہ اللہ کی حمد و ثنا میں انسان سے تقصیر ہو جاتی ہے ۔پس انسان کی جدوجہد جس قدر بھی زیادہ ہو' وہ محدود ہوتی ہے اور انسان ضعیف ہے ۔اور اللہ کی نعمتیں ہمیشہ بے شمار ہیں اور اس کا فیض عام ہے ۔

وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۱۴:۳۴) ''اگر تم اللہ کے احسانات کو شمار کرو تو تم ان کا استقصا اور احاطہ نہیں کر سکتے''۔ لہٰذا اس تقصیر پر استغفار کا حکم دیا گیا۔

فتح و کامرانی کے موقعہ پر تسبیح و استغفار میں ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ فخر و مباہات کے مقام پر نفس کے اندر یہ شعور پیدا کیا جائے کہ انسان تو ہمیشہ عجز اور تقصیر کے مقام پر ہوتا ہے ۔ لہٰذا اسے چاہئے کہ وہ بڑوں کی سطح سے ذرا نیچے اتر

آئے - اور اپنے رب سے اپنی تقصیرات کی معافی طلب کرے - اس طرح انسانی شعور اور انسانی نفسیات سے فخر و مباہات کے میلانات کا صفایا ہو جاتا ہے -

اگر ایک فاتح کے دل میں یہ شعور بیٹھ جائے کہ وہ عجز اور تقصیر کا پتلا ہے اور اسے اپنی تقصیرات پر اللہ سے دعائے مغفرت کرنا چاہئے تو ایسا فاتح کبھی بھی مفتوح لوگوں پر ظلم اور تعدی کا ارتکاب نہیں کر سکتا - ایسا شخص تو یوں سوچتا ہے کہ یہ تو اللہ کی ذات ہے جس کی نصرت کی وجہ سے وہ ان لوگوں پر مقتدر اعلیٰ بن گیا ہے - اگر اللہ کی نصرت نہ ہوتی تو وہ تو بندۂ ناچیز و پر تقصیر ہے اور اللہ نے جو اس کو اقتدار دیا ہے تو یہ اس لیے دیا ہے کہ اللہ مفتوح لوگوں کے بارے میں کوئی خیر اور بھلائی چاہتا ہے - در حقیقت فتح تو اللہ کی نصرت سے میسر ہوتی ہے - نصرت بھی اس کی ہے اور فتح بھی اس کی ہے اور یہ فاتح کی فتح نہیں بلکہ اللہ کے دین کی فتح ہے - اور تمام امور کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور تمام فیصلے اللہ کی طرف لوٹتے ہیں -

یہ ہے وہ روش اور بلند مرتبہ افق، جس کے اوپر نظریں مرکوز کرنے کے لیے قرآن پوری انسانیت کو دعوت دیتا ہے کہ وہ درجہ بدرجہ اس بلند افق تک بلند ہوتی چلی جائے - جو شرافت اور نیکی کا اعلیٰ مرتبہ ہے - اس تک پہنچ کر انسان بڑا بن جاتا ہے - اس لیے کہ وہ اپنی بڑائی سے دستکش ہو جاتا ہے - یہاں اس کی روح آزاد ہو کر مسرت حاصل کرتی ہے - اس لیے کہ وہ اللہ کی غلامی اختیار کر لیتی ہے -

غرض یہ ایک آزادی ہے جس میں انسان اپنی ذاتی اور مادی بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور انسان اللہ کی روحانی مخلوق میں سے ایک مخلوق بن جاتا ہے اور یہ ایک ایسے مقام تک جا پہنچتا ہے کہ اللہ کی رضا اس کی رضا بن جاتی ہے اور یہ مقام حاصل کرنے کے بعد پھر وہ مجاہد بن جاتا ہے اور اس کی جدوجہد کا رخ یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلامی نظام کی صورت میں بھلائی کی نصرت کرے اور حق کو حقیقت بنا دے اور پھر اسلامی نظام کے قیام کے بعد وہ اس زمین کو ایسی ترقی دے اور دنیا کو ایسی قیادت فراہم کرے کہ دنیا شر و فساد سے پاک ہو جائے - یہ قیادت صالح، پاک اور تعمیری ہو - اور اس کا مقصد ہر بھلائی کو پھیلانا اور ترقی دینا ہو - اور اس طرح تمام امور کا رخ اللہ کی طرف پھیر دے -

انسان اگر اپنی ذات کے محدود کنویں کا مینڈک ہو اور اس میں قید ہو تو پھر اس کی آزادی کی مساعی عبث بن جاتی ہیں - وہ آزادی کے بعد اپنی خواہشات کا غلام ہوتا ہے - شہوات اور خواہشات میں گرفتار ہوتا ہے - انسان اگر خواہشات نفسانیہ کے دائرہ نشیب سے آزاد نہ ہو تو دوسری آزادیاں عبث ہیں - اسلام چاہتا ہے کہ دوسری آزادیوں کے ساتھ انسان نفسانی خواہشات سے بھی آزاد ہو جائے تاکہ وہ اللہ کو یاد کرے اور اس کا غلام ہو -

یہ ہیں آداب نبوت، جو نبوت کے ساتھ لازم رہے ہیں اور اللہ کی مرضی یہ ہے کہ انسانیت ان آداب نبوت کے آفاق تک بلند ہو جائے - اور اگر وہاں تک نہ بھی پہنچ سکے تو اس کی نظریں اس افق پر ہوں - دیکھئے یوسف علیہ السلام اس مقام تک پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں - مصر کے تمام خزائن اقتدار ان کے ہاتھ میں آ چکے ہیں - ان کا خواب سچا ہو چکا ہے - انہوں نے جب والدین کو اپنے تخت پر اٹھایا تو بھائیوں نے ان کے سامنے سجدہ کیا، اور حضرت یوسف نے والدین سے کہا کہ باپ! یہ ہے میری خواب کی تعبیر، اللہ نے تو اسے حقیقت بنا دیا - اللہ کا احسان دیکھئے کہ اس نے مجھے قید سے نکالا، آپ لوگوں کو دیہات سے مصر لایا حالانکہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان نزاع ڈال دیا تھا - بے شک میرا رب لطیف تدابیر اختیار کرتا ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے -

غرض ایسے موقعہ پر حضرت یوسف علیہ السلام بلندی' سرفرازی اور خوشی اور انبساط کے ماحول سے نکل آتے ہیں اور ذکر و فکر میں مشغول ہوکر اپنے رب کی حمد وثنا کرتے ہیں۔ وہ اقتدار کے عروج پر ہیں ان کے تمام خواب حقیقت بن گئے ہیں لیکن ان کی دعوت یہ ہے:

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (۱۲: ۱۰۱) "اے میرے رب! تو نے مجھے اقتدار بھی دیا' اور مجھے باتوں کی تہ تک پہنچنے کا علم بھی دیا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا و آخرت میں میرا کارساز ہے۔ مجھے اسلام پر موت دے اور نیکوکاروں کے زمرے میں مجھے شامل کر"۔ یہاں جاہ و اقتدار پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ اہل و عیال اور بہن بھائیوں کا یہ اجتماع اور ایک عرصہ بعد رشتہ داروں اور والدین کی ملاقات کی خوشی کافور ہو جاتی ہے۔ اب اس آخری منظر میں ہمیں ایک ایسا فرد نظر آتا ہے جو رب تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا رہا ہے اور سوال یہ ہے کہ میرا اسلام محفوظ ہو اور میری سوسائٹی صالحین کے ساتھ ہو۔ اور یہ مرتبہ اللہ کے فضل و کرم سے ہی مل سکتا ہے۔

اب حضرت سلیمان علیہ السلام کے آداب زندگی ملاحظہ ہوں۔ وہ بھی ایسے حالات میں ہیں کہ طرفۃ العین میں ملکہ سبا کا تخت ان کے سامنے ہے۔ دیکھئے قرآن ایسے حالات میں قوت و جاہ کے حالات میں ان کی کیفیات کس طرح ریکارڈ کرتا ہے۔

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ وَ مَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ كَرِیْمٌ (۲۷: ۴۰) "جب سلیمان نے تخت کو اپنے پاس رکھا ہوا پایا۔ تو وہ پکار اٹھے یہ میرے رب کے فضل و کرم سے ہے۔ یہ اس لیے کہ وہ مجھے آزمائے کہ میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں یا کفران نعمت کا مرتکب ہوتا ہوں۔ اور جو کوئی شکر کرے گا اپنے ہی لیے کرے گا اور جو ناشکری کرے گا میرا رب غنی اور بزرگ ہے"۔

اور یہی تھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روش۔ آپؐ کو اپنی پوری زندگی میں یہی ادب اختیار کیا اور نصرت و فتح کے موقعہ پر جسے اللہ نے آپ کے لیے خاص علامت قرار دیا تھا۔ تو حضور اپنی سواری کے اوپر جھکے ہوئے جا رہے تھے۔ آپؐ مکہ میں اسی طرح سر جھکائے ہوئے داخل ہوئے۔ آج آپ اس مکہ میں جس نے آپ کو اذیتیں دی تھیں' جس نے آپ کو گھر سے نکالا تھا۔ جس نے آپ کے ساتھ پے درپے جنگیں لڑیں' جو آپؐ کی دعوت کی راہ میں معاندانہ طور پر ڈٹ گیا تھا۔ جب آپؐ کو نصرت اور فتح نصیب ہوئی تو آپؐ نے فتح و کامرانی کے شادیانے نہ بجائے۔ آپ رب کا شکر ادا کرتے ہوئے جھکے جا رہے تھے۔ حمد و ثنا میں مشغول تھے اور جس طرح رب تعالیٰ نے آپؐ کو تلقین کی تھی۔ آپؐ تسبیح و تہلیل اور استغفار کر رہے تھے۔ جیسا کہ آثار میں آتا ہے کہ آپ کے بعد آپؐ کے صحابہؓ کا رویہ بھی ایسا ہی رہا۔ اللہ ان سے راضی ہو۔

یوں بشریت ایمان کے ذریعہ سربلند ہوئی۔ انسانیت کا چہرہ روشن ہو گیا۔ وہ صاف و شفاف ہو گئی۔ اب انسانیت عظمت' قوت اور آزادی کے مقام بلند تک پہنچ گئی۔

---○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۂ اللھب ۔ ۱۱۱

۱--- تا --- ۵

سورۂ اللھب ایک نظر میں

ابولہب کا نام عبدالعزی ابن عبدالمطلب تھا۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا۔ ''ابولہب'' کے نام سے اس لیے مشہور ہوگیا کہ وہ شعلے کی طرح سرخ چہرہ رکھتا تھا۔ یہ اور ان کی بیوی' ام جمیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت زیادہ اذیت دیتے تھے۔ اور دعوت اسلامی کے جانی دشمن تھے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے حسین ابن عبداللہ بن عبید اللہ ابن عباس نے بتایا' کہتے ہیں میں ربیعہ ابن معاذ دیلمی کو یہ کہتے سنا ''میں اپنے والد کے ساتھ تھا اور جوان تھا کہ ایک نوجوان شخص (رسول اللہؐ) کو میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک ایک قبیلے کے پاس جاتے ہیں (اور ان کے پیچھے ایک دوسرا شخص ہے جو حسین و جمیل ہے اور بڑے بڑے بالوں والا ہے اور بھینگا ہے) اور کہتے ہیں: ''اے بنی فلاں میں تمہاری طرف اللہ کی طرف سے رسول بناکر بھیجا گیا ہوں۔ میں تمہیں یہ حکم دیتا ہوں کہ صرف اللہ کی بندگی کرو' اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو' میری تصدیق کرو' اور میری حمایت و مدافعت کرو تاکہ میں اس چیز کو نافذ کرسکوں جس کے ساتھ مجھے اللہ نے رسول بناکر بھیجا ہے''۔ یہ نوجوان جب اپنی بات سے فارغ ہوتا تو اس کے پیچھے کھڑا یہ دوسرا شخص یہ کہتا ''اے بنی فلاں یہ شخص یہ چاہتا ہے کہ تم لات اور عزیٰ کو چھوڑ دو' اور بنی مالک ابن اقمس کے ان دوستوں کو بھی چھوڑ دو جو تمہارے حلیف ہیں اور اس بدعت اور گمراہی کو قبول کرلو جو یہ لے کر آیا ہے۔ اس کی بات نہ سنو اور نہ اس کی اطاعت کرو''۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا یہ شخص کون ہے؟ تو انہوں نے کہا ''یہ ان کا چچا ابولہب ہے۔ (امام احمد و امام طبرانی)

یہ ایک نمونہ ہے ابولہب کی سازشوں کا جو وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کے خلاف کرتا رہتا تھا۔ ام جمیل' اس کی بیوی اس سلسلے میں اس کی معاون تھی۔ ان کی مہم نہایت ظالمانہ اور شدید تھی۔ ام جمیل کا نام اروی بنت حرب ابن امیہ ہے۔ یہ ابوسفیان کی بہن تھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوت کے خلاف ابولہب کا یہ رویہ اول روز سے تھا۔ امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ' حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ وادی بطحا کی طرف نکلے اور ایک پہاڑ پر چڑھ گئے اور پکارا "باصباحاہ" اس پر قریش سب کے سب پہاڑ پر جمع ہوگئے۔ تو آپؐ نے ان سے پوچھا کہ بتاؤ اگر میں تم سے کہوں کہ دشمن تم پر صبح کو حملہ کرنے والا ہے یا شام کو تو کیا تم میری بات کی تصدیق کروگے؟ تو انہوں نے کہا ''ہاں''۔ تو آپؐ نے فرمایا ''سنو میں تمہیں ایک شدید عذاب سے ڈراتا ہوں جو تم پر آنے والا ہے۔ اس پر ابولہب نے کہا ''کیا تم نے ہمیں اس لیے جمع کیا تھا تم ہلاک ہو جاؤ''۔ اس پر اللہ نے یہ سورت نازل کی۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (۱۱۱:۱) ''ٹوٹ گئے ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ ہلاک ہوا''۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ یہ اٹھا اور اپنے ہاتھ جھاڑنے لگا اور اس نے کہا ہلاکت ہو تم پر سارا دن؟ کیا تم نے ہمیں اسی لیے جمع کیا تھا تو اللہ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

جب بنو ہاشم نے ابو طالب کی قیادت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کا فیصلہ کیا' اگرچہ انہوں نے آپؐ کے دین کو قبول نہ کیا تھا لیکن عصبیت کے اصولوں کے مطابق انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کا فیصلہ کیا تو ابولہب بنو ہاشم سے نکل گیا۔ اور اس نے آپؐ کے خلاف قریش کے ساتھ حلیفانہ معاہدہ کیا۔ اور جب انہوں نے حضور اکرمؐ اور بنو ہاشم کے ساتھ مقاطعہ کیا اور اس سلسلے کی تحریر پر ابولہب نے بھی دستخط کیے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بنو ہاشم کو قحط سے ڈرا کر اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حوالے کر دیں۔

آپؐ کی دو صاحبزادیاں رقیہ اور ام کلثوم ابولہب کے دو بیٹوں کی مخطوبہ تھیں۔ یہ رشتہ بعثت سے قبل ہوا تھا۔ ابولہب نے اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ ان کو طلاق دے دیں تاکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر خاندانی بوجھ بڑھ جائے۔

یوں ابولہب اور ان کی بیوی ام جمیل نے آپؐ کے خلاف شدید جنگ جاری رکھی ہوئی تھی۔ یہ دونوں دعوت اسلامی کے شدید دشمن تھے اور یہ جنگ انہوں نے اپنی پوری زندگی جاری رکھی۔ کسی وقت بھی اس میں انہوں نے کوئی رو رعایت نہ کی۔ ابوجہل کا گھر حضور اکرمؐ کے گھر کے قریب تھا اس لیے آپؐ کو اذیت دینے کے مواقع بھی اس کو بہت ملتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ام جمیل کانٹے جمع کرتی اور حضورؐ کے راستے میں رکھ دیتی۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ لکڑیاں اٹھانا حضورؐ کے خلاف فتنے اٹھانے۔ آپؐ کو اذیت دینے اور آپؐ کے خلاف سازشیں کرنے سے استعارہ ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۱۳ تشریح آیات

۱-- تا-- ۵

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝١ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝٢ سَيَصْلٰى
نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝٣ وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝٤ فِىْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝٥ ع ۵

۳۶

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ۔ اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اس کے کسی کام نہ آیا۔ ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا اور (اس کے ساتھ) اس کی جورو بھی' لگائی بجھائی کرنے والی' اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی“۔

یہ سورت اللہ کی طرف سے اس لیے نازل ہوئی کہ ابولہب اور اس کی بیوی کی طرف سے برپا کی ہوئی جنگ میں حضور کی حمایت کی جائے۔ گویا یہ معرکہ اللہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (۱۱۱ : ۱) ”ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ“۔ تبت' تاب سے مشتق ہے جس کے معنی ہلاکت' تباہی اور انقطاع کے ہیں۔ یہاں تبت کے معنی ہیں بددعا کے اور دوسرے تب کے معنی ہیں کہ وہ ہلاک ہو گیا تباہ ہو گیا اور اس کا سلسلہ کٹ گیا۔ یہ خبر ہے وقوع بددعا کی۔ سورت کے آغاز ہی میں اس مختصر آیت میں بددعا اور اس کی تکمیل کا مکمل منظر ہے۔ گویا معرکہ ختم ہو جاتا ہے اور پردہ گر جاتا ہے۔

اس کے بعد' آنے والی دوسری آیت میں حقیقت واقعہ کا بیان ہے۔

مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ (۱۱۱ : ۲) ”اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اس کے کسی کام نہ آیا“۔ اس کے ہاتھ ٹوٹ گئے' وہ ہلاک و برباد ہو گیا۔ اس کا مال اور اسلام کے خلاف جدوجہد اس کے کچھ کام نہ آئی اور اس کی دولت اور اس کی مکاریاں اسے ہلاکت سے نہ بچا سکیں۔

یہ تو تھا اس کا انجام دنیا میں ۔ آخرت میں اس کا انجام کیا ہو گا؟

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (۱۱۱ : ۳) ”ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا“۔ لھب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آگ بہت شدید اور شعلہ بار ہو گی اور سخت بھڑکی ہوئی ہو گی۔

وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (۱۱۱ : ٤) ”اور اس کی جورو لکڑیاں اٹھانے والی“ بھی اس آگ میں ڈالی جائے گی ' اس حال میں کہ وہ لکڑیاں اٹھائے ہوئے ہو گی اور اس حال میں کہ۔

فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (۱۱۱ : ۵) ”اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہو گی“۔ اور اس رسی کے ساتھ اسے آگ میں باندھ دیا جائے گا یا یہ رسی وہ ہو گی جس کے ساتھ لکڑیاں باندھی جاتی ہیں۔ اگر اس کا حقیقی معنی لیا جائے تو وہ وہاں بھی لکڑیوں اور کانٹوں کا گٹھا اٹھائے ہوئے جہنم میں جائے گی اور اگر مجازی معنی لیا جائے تو معنی یہ ہو گا جو شرارت کی آگ کو بھڑکاتی ہے۔ اور فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے کی سعی کرتی ہے۔

اس سورت کا طرز ادا اس کے موضوعات اور معانی کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ سورت کی فضا کے مناسب طرز تعبیر اختیار کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں میری کتاب ”قرآن میں مناظر قیامت“ سے چند سطریں یہاں نقل کرنا ضروری ہیں۔ ان کا یہاں نقل کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اس سورت کے نزول سے ام جمیل کے دل میں ایک ایسا تیر لگا جس کی وجہ سے وہ برافروختہ ہو گئی اور پاگل ہو کر رہ گئی۔

”ابولہب (شعلوں کا باپ) ایک ایسی آگ میں تپایا جائے گا جو شعلہ زن ہو گی اس کی عورت جو حضورؐ کی راہ میں خار دار جھاڑیاں لاکر ڈالتی تھی وہ جہنم میں اس حال میں گرائی جائے گی کہ اس کے گلے میں مونجھ کی رسی بندھی ہو گی“۔

”الفاظ بھی باہم متناسب اور صوتی ہم آہنگی رکھنے والے ' تصاویر بھی باہم یک رنگ ' بس جہنم میں اس کو گرایا جائے گا وہ شعلہ بار ہے۔ اس میں شعلوں کے باپ (ابولہب) کو گرایا جائے گا۔ اس کی عورت لکڑیاں لاتی ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں ڈالتی ہے اور آپؐ کو ایذائیں دیتی ہے ' خواہ حقیقی معنی لیا جائے یا استعارہ۔ لکڑیوں سے آگ کو بھی بھڑکایا جاتا ہے اور ان لکڑیوں کو رسیوں میں باندھ کر لایا جاتا ہے۔ اس لیے جہنم شعلہ زن میں اسے مونجھ کی رسی سے باندھ دیا جائے گا۔ اور اسے اس رسی سے باندھ دیا جائے گا جس سے وہ لکڑیاں لاتی تھی۔ تاکہ سزا ایسی ہو جیسا اس کا جرم تھا۔ اور یہ تصویر اپنے سادہ رنگوں کے ساتھ سامنے آئے اور اس کے رنگ میں لکڑیاں ' رسی ' آگ اور شعلے ہوں۔ اور اس آگ میں میاں بیوی دونوں تپ رہے ہیں“۔

ایک دوسرے زاویہ سے بھی اس سورت میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ الفاظ کی صوتی جھنکار ' لکڑیوں کے گٹھے کے باندھنے کی آواز اور گردن کو رسی سے باندھنے کی آواز بھی باہم یکساں ہیں۔ ذرا پڑھئے۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (۱۱۱ : ۱) ان الفاظ میں شد کی صوتی درشتگی ایسی ہی ہے جس طرح لکڑیوں کے گٹھے کو باندھنے میں سختی ہوتی ہے۔ جس طرح یہ الفاظ شدید ہیں اسی طرح گردن میں رسی باندھنے کا عمل اور

اسے کھینچنا شدید ہے۔ اور پوری سورت میں اسی طرح کی گھٹن کی فضا ہے"۔

اس طرح صوتی ترنم، عملی کشاکش کی آواز، اور سورت کی حرکات کی جزئیات کے درمیان گہری مناسبت اور ہم آہنگی ہے۔ پھر الفاظ بھی ہم جنس، اور تعبیر میں یکسانی کا لحاظ، سب کے سب سورت کی فضا کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ پھر یہ تمام چیزیں سبب نزول اور سورت کے پس منظر کے ساتھ بھی جڑی ہوئی ہیں۔ یہ سب فنی خوبیاں صرف پانچ مختصر فقروں میں ملحوظ خاطر رکھی گئی ہیں اور قرآن کی مختصر ترین سورتوں میں سے ایک میں اس فنی کمال کو ظاہر کیا گیا ہے۔

اس سورت کی ان فنی خوبیوں کی وجہ سے اور بے پناہ اثر کی وجہ سے ام جمیل کا تاثر یہ تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں اس کی ہجو کی ہے۔ یہ سورت فوراً مکہ میں پھیل گئی تھی، جس میں میاں بیوی کی مذمت کی گئی تھی، ان کو دھمکی دی گئی تھی اور نہایت بھدی تصویر کھینچی گئی تھی۔ یہ ایسی تصویر کشی تھی جس نے ایک خود پسند عورت کے دل کو چور چور کر دیا۔ جسے اپنے نسب وحسب پر بہت ہی غرور تھا۔ جو اپنے آپ کو بہت ہی اونچے گھرانے کی عورت سمجھتی تھی۔ لیکن قرآن نے اس کی تصویر کشی یوں کی:

حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (٤) فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (١١١: ٥) "عورت، جو لکڑیاں اٹھانے والی ہے اور جس کے گلے میں چھال کی رسی بندھی ہوئی ہے"۔ یہ نہایت ہی عام صورت حالات ہے جو عربوں میں عام تھی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں مجھ تک یہ تذکرہ پہنچا ہے کہ ام جمیل حمالة الحطب نے جب اس سورت کے نزول کے بارے میں سنا کہ یہ اس کے بارے میں اور اس کے خاوند کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ گئی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؐ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی مٹھی پتھروں سے بھری ہوئی تھی، جب یہ ان دونوں کے پاس آکر کھڑی ہوئی تو اللہ نے اس کی آنکھوں پر اس طرح پردہ ڈال دیا کہ وہ صرف ابوبکر کو دیکھ سکتی تھی۔ تو اس نے کہا: "ابوبکر کہاں ہے تمہارا ساتھی، مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس نے میری ہجو کی ہے۔ خدا کی قسم اگر وہ مجھے ملتا تو میں ان پتھروں سے اسے مارتی۔ خدا کی قسم میں بھی تو شاعرہ ہوں اس کے بعد اس نے یہ شعر پڑھا

مذمما عصینا   وامره ابینا

وہ محمد نہیں بلکہ مذمت کیے ہوئے ہیں، ہم نے ان کی نافرمانی کی ہے اور ان کے احکام ماننے سے انکار کر دیا یا ان کے دین کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔

یہ واپس چلی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہؐ سے کہا: کیا اس نے آپؐ کو نہیں دیکھا۔ آپؐ نے فرمایا "اس نے مجھے نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی نظر کو مجھ سے کھینچ لیا تھا"۔

حافظ ابوبکر بزار نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے، جب سورہ

تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ (١١١: ١) نازل ہوئی تو ابولہب کی بیوی حرم میں آئی۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ کعبہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا حضورؐ اگر

آپؐ ایک طرف ہو جائیں تو یہ آپؐ کو اذیت نہ دے سکے گی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میرے اور اس کے درمیان پردہ حائل ہو جائے گا"۔ یہ آئی اور حضرت ابوبکرؓ کے پاس کھڑی ہو گئی اور کہا: "ابوبکر تمہارے ساتھی نے ہماری ہجو کی ہے"۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: "اس گھر کی قسم انہوں نے ایسا نہیں کیا' وہ نہ شعر کہتے ہیں اور نہ ہی پڑھتے ہیں"۔ تو اس نے کہا آپؓ تو سچے ہیں۔ جب واپس گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "حضورؐ کیا اس نے آپؐ کو نہیں دیکھا؟ تو آپؐ نے فرمایا "جب تک وہ کھڑی رہی فرشتے مجھ پر ستر پھیلاتے رہے جب تک وہ چلی نہیں گئی"۔

غرض اس کا پارہ اس قدر چڑھ گیا تھا کیونکہ یہ سورت پھیل گئی تھی' اس نے اسے اپنی ہجو سمجھا۔ اس زمانے میں ہجو صرف اشعار میں ہوتی تھی۔ اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے جائز طور پر ہجو کی تردید کر دی۔ اور وہ بہت سچے مانے جاتے تھے لیکن ان آیات میں اس کی جو حقارت آمیز تصویر کشی کی گئی ہے وہ اس دائمی کتاب میں ریکارڈ کر دی گئی ہے۔ اللہ کی کتاب بھی لازوال ہے اور ان دونوں کی مذمت بھی لازوال ہو گئی۔ اور یہ ایسی تصویر ہے جو ایک بولتی تصویر ہے۔ یہ ہے سزا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوت کے خلاف سازش کرنے کی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بھی دعوت اسلامی اور داعیان حق کے خلاف اس قسم کی سازشیں کرتے ہیں ان کی قسمت میں دنیا میں بھی ناکامی لکھی ہوئی ہے۔ وہ یہاں بھی ہلاک اور برباد ہوں گے۔ اور آخرت میں بھی وہ ایک سخت سزا پائیں گے۔ یہ ان کی مناسب سزا ہو گی۔ دنیا میں لکڑہاروں کی رسی جس ذلت کی طرف اشارہ کرتی ہے' آخرت میں بھی یہ رسی اس کے گلے میں ہو گی اور یہ ذلت کی کافی نشانی ہو گی۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۂ الاخلاص ۔ ۱۱۲

۱--- تا --- ۵

سورۂ الاخلاص ایک نظر میں

صحیح روایات میں آتا ہے کہ یہ مختصر سورت پورے قرآن کے ایک تہائی حصے کے برابر ہے ۔امام بخاری فرماتے ہیں : حدیث بیان کی اسماعیل نے ' مالک سے 'انہوں نے عبدالرحمٰن ابن عبداللہ ابن عبدالرحمٰن ابن صعصعہ سے ' انہوں نے اپنے والد سے 'انہوں نے ابوسعد سے ' وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو یہ پڑھتے سنا۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱۱۲ : ۱) یہ اسے بار بار پڑھ رہا تھا۔جب صبح ہوئی تو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا' یہ تذکرہ کرنے والا یہ تاثر دے رہا تھا کہ یہ بہت کم ہے جو پڑھنے والا پڑھ رہا تھا' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ' یہ سورت تو ایک تہائی قرآن کے برابر ہے"۔

یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے اس لیے کہ جس توحید کے اعلان کرنے کا حکم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱۱۲ : ۱) "کہہ دو کہ وہ اللہ یکتا ہے"۔یہ عقیدہ توحید انسانی ضمیر کا بھی عقیدہ ہے' یہ اس کائنات کی تفسیر بھی ہے اور یہ زندگی کا ایک نظام بھی ہے لہٰذا یہ سورت اسلامی نظام زندگی کے اہم ترین خطوط کا ایک بنیادی نقشہ پیش کرتی ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۲۳ تشریح آیات

۱-- تا-- ۴

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴

۱
ع ۴
۳۷

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"کہو' وہ اللہ ہے 'یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے"۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱۱۲ : ۱) "کہو' وہ اللہ ہے یکتا"۔ احد کا لفظ واحد سے زیادہ گہرا ہے کیونکہ احد' واحد کے مفہوم پر مزید اضافہ کرتا ہے 'کہ اس کے ساتھ اور کوئی چیز حقیقتاً موجود نہیں ہے اور اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے یعنی وہ یکتا ہے۔

"احد" میں وجود کی احدیت کا اظہار ہے' یعنی اس کی حقیقت کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کے سوا اور کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔ اللہ کے سوا جس قدر موجودات ہیں وہ اپنا وجود اللہ سے اخذ کرتی ہیں اور وہ اپنی حقیقت اللہ کی حقیقت سے لیتی ہیں۔ وہ فاعلیت میں بھی یکتا ہے لہٰذا اللہ کے سوا اس پوری کائنات میں کوئی اور موثر اور کوئی اور فاعل نہیں ہے۔ لہٰذا یہ ایک نظریہ اور عقیدہ ہے جو انسان کے ضمیر میں جاگزیں ہوتا ہے اور یہ دراصل اس کائنات کی تفسیر بھی ہے۔ جب کسی دل میں یہ عقیدہ بیٹھ جاتا ہے اور عقل اس کا تصور کر لیتی ہے۔ اور اس پوری کائنات کی تفسیر اس کی روشنی میں ہو جاتی ہے تو انسانی دل پر کوئی اور تصور نہیں چھاتا اور انسانی قلب میں کسی اور سوچ کا شائبہ نہیں رہتا۔ اور انسانی قلب اس واحد ذات واجب الوجود کے سوا کسی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا' کیونکہ دراصل موجود تو یہی ذات یکتا ہے اور فعال اور مؤثر بھی یہی واحد ذات ہے۔

پھر اس کائنات میں جو چیزیں بھی پائی جاتی ہیں ان کے ساتھ قلب انسانی کا رابطہ ختم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ہونا یہ چاہئے تھا

کہ انسانی دل سے ماسوی اللہ کے وجود کا شعور ہی ختم ہو جائے۔ اگر یہ شعور ختم نہ بھی ہو، تعلق ختم ہو جاتا، اس لیے کہ اللہ کے وجود کے سوا تمام دوسری اشیاء کے وجود کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور اس پوری کائنات میں اللہ کے ارادے کی فاعلیت اور تاثیر کے سوا کوئی اور چیز فعال اور موثر بھی نہیں ہے۔ لہٰذا عقیدۂ توحید کے بعد قلب انسانی کسی ایسی چیز سے کیوں متعلق ہو جو نہ حقیقتاً موجود ہے اور نہ کسی چیز میں فعال و موثر ہے۔

اب جب دل الٰہ یکتا کے سوا تمام اشیاء کی حقیقت کے تصور ہی سے خالی ہو گیا اور اس میں ماسوی اللہ سے تعلق ہی نہ رہا۔ تو اب یہ دل صحیح میں آزاد ہوتا ہے، وہ ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس دل کی تمام خواہشات ختم ہو جاتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ خواہشات ہی دراصل پاؤں کی زنجیریں ہوتی ہیں۔ پھر خوف بھی اس دل سے ختم ہو جاتا ہے اور یاد رہے کہ اس خوف کی وجہ سے بھی انسان پابند سلاسل ہو جاتا ہے۔ انسان کے دل سے مرغوبات کیوں ختم ہو جاتی ہیں اس لیے کہ جب وہ اللہ کو پا لیتا ہے تو وہ سب کچھ پا لیتا ہے اور وہ ڈرتا اس لیے نہیں کہ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی فعال نہیں۔

جب انسانی شعور میں یہ حقیقت اچھی طرح بیٹھ جائے کہ انسان کو اس کائنات میں صرف اللہ کی حقیقت نظر آتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر اس کائنات میں انسان کو جو وجود نظر آئے گا اس میں بھی اسے یہی حقیقت نظر آئے گی۔ اس طرح پھر انسانی قلب کو ہر چیز میں دست قدرت نظر آتا ہے اور اس کے بعد پھر انسان اس درجے پر فائز ہوتا ہے کہ اسے اس کائنات میں اللہ کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

اس عقیدے اور تصور کے نتیجے میں انسان سوچنے لگتا ہے کہ ظاہری اسباب بھی ہیچ ہیں۔ اصل اور حقیقی سبب مسبب الاسباب ہے یعنی ذات باری تعالیٰ۔ یہ وہ نکتہ ہے جس کی طرف قرآن نے بہت توجہ کی ہے اور اسے اسلام کی ایمانیات میں داخل کر کے ذہنوں میں بٹھانے کی سعی کی ہے۔ چنانچہ ظاہری اسباب کو برطرف کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ اصل سبب مشیت الٰہیہ ہے۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸ : ۱۷) "جب تم نے پھینکا تو دراصل تم نے نہیں پھینکا مگر اللہ نے پھینکا"۔ اور آل عمران (۱۲۶) میں یہ کہا گیا:

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (۳: ۱۲۶) "فتح و نصرت صرف اللہ کی طرف سے ہے"۔ اور الدھر (۳۰) میں ہے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۷۶: ۳۰) "اور تم نہیں چاہتے الا یہ کہ اللہ چاہے"۔ اسی طرح کی بے شمار اور آیات ہیں۔

جب انسان اسباب ظاہری کو برطرف کر دیتا ہے تو پھر اسے نظر آتا ہے کہ تمام امور اللہ کی مشیت سے طے پاتے ہیں۔ پھر اس سے اس کے دل میں اطمینان پیدا ہو جاتا ہے اب وہ تمام مرغوبات اللہ سے طلب کرتا ہے اور تمام مکروہات سے بچنے کے لیے اللہ کے ہاں پناہ ڈھونڈتا ہے اور ظاہری عوامل، ظاہری اسباب اور موثرات جو کچھ کرتے نظر آتے ہیں، اس کائنات میں ان کی کوئی حقیقت اس کی نظروں میں نہیں ہوتی۔

یہ تھے وہ مقامات جن کو عبور کرنے کی سعی صوفیاء کرتے رہے۔ لیکن ان مقامات کی کشش ان کو کہیں دور ہی لے گئی۔ صوفیا اس بات کو سمجھ نہ سکے کہ اسلام لوگوں کو بلا کر ان مقامات بلند تک ضرور لے جاتا ہے لیکن وہ ان کو اس دنیا کی عملی زندگی کے تمام نشیب و فراز کے اندر رکھتے ہوئے اور ہر طرح کی انسانی زندگی کے اندر رہتے ہوئے اور اس زمین پر اللہ کی نیابت کے فرائض کی ادائیگی کرتے ہوئے ان مقامات تک پہنچاتا ہے۔ وہ اس دنیا کی زندگی میں بھرپور حصہ بھی لیتے ہیں اور اسے ہیچ بھی سمجھتے ہیں۔ وہ اس کائنات میں رہتے ہیں لیکن وہ حقیقی موجود صرف اللہ کو سمجھتے ہیں۔ وہ تمام واقعات و حادثات میں فعال اور موثر اللہ کو سمجھتے ہیں۔ اور اس طریقے کے سوا اسلام کوئی دوسرا طریقہ نہیں اپناتا' نہ چاہتا ہے۔ پس اس کے نتیجے میں ایک مکمل نظام زندگی وجود میں آتا ہے۔ یہ نظام اس کائنات کی اس تشریح اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے شعور' تصورات اور رجحانات کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس نظام زندگی کے خدوخال کیا ہیں؟

(۱) اس نظام کا ایک اپنا نظام عبادت ہے جس میں صرف اللہ کی بندگی کی جاتی ہے۔ وہ اللہ جس کے وجود کے سوا کسی وجود کی کوئی حقیقت نہیں' جس کی فاعلیت کے سوا کوئی اور فاعلیت نہیں۔ اور اس کے ارادے کے سوا کسی اور کا ارادہ موثر نہیں۔

(۲) یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں ایک انسان ہر حالت میں' امید میں اور خوف میں صرف اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ خوشی اور غم میں' امیری اور فقیری میں' غرض ہر حال میں اس کا رخ صرف اللہ وحدہ کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس نظام میں ہر شخص یہ جانتا ہے کہ جب اللہ کے سوا کسی اور چیز کا وجود ہی حقیقی نہیں۔ تو پھر اس کی طرف توجہ اور پکار کا فائدہ کیا ہوگا۔ جب اللہ کے سوا اور کوئی نہ فاعل ہے اور نہ موثر تو پھر اس کی طرف توجہ سے حاصل کیا ہوگا۔

(۳) یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں ہدایات صرف اللہ سے لی جاتی ہیں۔ عقائد و نظریات' اقدار اور پیمانے' شریعت اور قانون' ادارے اور انتظام' رسوم و رواج' آداب و تقالید سب کی سب اللہ سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہر قسم کی ہدایت اور رہنمائی صرف اللہ وحدہ سے لی جاتی ہے۔ جو حقیقت واقعہ میں بھی اور ایک مسلم کے ضمیر میں بھی واحد موجود ہے۔

(۴) یہ نظام ایک نظام تحریک اور عمل ہے۔ اور یہ تحریک و عمل صرف اللہ وحدہ کے لیے ہے۔ اس کی رضا کے حصول کے لیے اس کے قرب کے حصول کے لیے۔ اس امید پر کہ اس تک پہنچنے کی راہ میں تمام پردے اور رکاوٹیں دور ہوں گی۔ اور گمراہی کے تمام شوائب سے انسان محفوظ ہو گا' چاہے یہ پردہ اور رکاوٹیں نفس انسانی کے اندر ہوں' یا انسانی ماحول کی چیزوں اور انسانوں کی طرف سے ہوں۔ جن میں خود انسان کی ذات' انسان کا خوف اور اس کی خواہش اور اس دنیا میں اس کی مرغوب اشیاء سرفہرست ہیں۔

(۵) یہ ایک ایسا نظام ہے کہ مذکورہ بالا امور کے ساتھ ساتھ وہ قلب بشری اور اس کائنات کی تمام موجودات کے درمیان' محبت' انس' تعاون' یگانگت کا تعلق پیدا کرتا ہے۔ اس لیے کہ دنیا کے بندھنوں سے آزادی کے معنی یہ نہیں کہ انسان اس کو مکروہ سمجھے' اس سے نفرت کرے' اس سے بھاگے اور اس کے برتنے سے اجتناب کرے۔ اس لیے کہ دنیا کی اشیاء سب کی سب اللہ کے دست قدرت کے کرشمے ہیں۔ ان کا وجود اللہ کے وجود سے ماخوذ ہے۔ اور سب اشیاء پر اسی حقیقت کی پرتو پڑتی ہے' لہٰذا یہ سب چیزیں محبوب ہیں کیونکہ یہ اللہ کے تحفے ہیں جو حبیب ہے۔

(۶) یہ نظام نہایت بلند اور آزاد نظام ہے' اس کی نظروں میں زمین ایک چھوٹی سی گیند ہے' دنیا کا سازوسامان بے قیمت ہے اور ان پردوں اور رکاوٹوں سے آزادی سب کی تمنا ہے لیکن دنیا کی غلامی سے آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان دنیاوی امور سے الگ تھلگ ہو جائے اور اس دنیا کو یونہی مہمل چھوڑ دے ۔یا اس سے نفرت کرے' اور اس سے بھاگے' بلکہ اسلامی نظام کا تقاضا یہ ہے کہ جہد مسلسل ہو' دائمی جدوجہد برپا ہو' انسانیت کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے تک ترقی دی جائے' اور انسان کی زندگی پوری طرح آزاد اور فری ہو۔پس دنیا کی زندگی کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ منصب خلافت الٰہیہ ہے جس کی اپنی ذمہ داریاں ہیں لیکن ان ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے انسان ان کا غلام بھی نہیں ہے ۔ان سے آزاد بھی ہے جیسا کہ ہم نے اس کی تشریح کی ۔

دنیا سے چھٹکارے کا ایک تو وہ طریقہ ہے جو گرجوں نے تجویز کیا لیکن اسلام صومعاتی رہبانیت کا قائل نہیں ہے اس لیے کہ انسان نے خلافت ارضی کے فرائض بھی سرانجام دینے ہیں اور انسانوں کو ایک اچھی قیادت کی بھی ضرورت ہے ۔ اور یہ دونوں امور انسان کی نجات اور فلاح اور اس دنیا کی غلامی سے چھٹکارے کے لیے ضروری ہیں۔یہ راہ بہت دشوار ہے ۔ یعنی انسان کی انسانیت کا تحقق صرف اسی صورت میں ممکن ہے ۔اس طرح انسان کی شخصیت میں روحانیت کا غلبہ ہو جاتا ہے ۔اور یہ ہے آزادی' انسان کی روح دنیاوی آلائشوں سے آزاد ہو کر اپنے اصلی مصدر کی طرف آزاد ہو جاتی ہے اور انسان کو اللہ نے پیدا کر کے جس دنیا میں چھوڑا ہے اس میں کام کرتے ہوئے بھی وہ اپنی اعلیٰ روحانی مقام اور حقیقت کو برقرار رکھتا ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ رسالت کے آغاز میں دعوت کو صرف عقیدۂ توحید تک محدود رکھا گیا اور مندرجہ بالا معنوں میں عقیدۂ توحید کو لوگوں کے ذہنوں میں بٹھانے کی کوشش کی گئی کیونکہ اس معنی میں توحید انسانی قلب و ضمیر میں بیٹھا ہوا ایک عقیدہ بھی ہے ۔اس کائنات کی تفسیر و تشریح اور تعبیر بھی ہے اور ایک مکمل نظام حیات بھی ہے ۔اس مفہوم میں عقیدۂ توحید صرف الفاظ نہیں جن کا اقرار زبان سے کر دیا جائے اور صرف انسانی ضمیر و شعور کا پختہ یقین بھی نہیں ہے جو صرف ضمیر و شعور کے اندر ہی پوشیدہ ہو' یہ سب کچھ ہے' پورا دین ہے بلکہ اس عقیدے کی تفصیلات ہیں ۔اس کے کچھ نتائج ہیں اور یہ تفصیلات اور یہ نتائج اس عقیدے کے طبعی اور لازمی نتائج ہیں ۔اور یہ نتائج قوانین طبیعیہ کی طرح سامنے آتے ہیں ۔اگر دین میں یہ عقیدہ موجود ہو۔

اہل کتاب کے اندر جو انحراف پیدا ہوا' جس نے ان کے عقائد و تصورات' ان کی عملی زندگی کو برباد کر دیا' اس کا آغاز بھی پہلے پہل حقیقی عقیدۂ توحید کے مٹ جانے کی وجہ سے ہوا۔ عقیدۂ توحید کے مٹنے کے بعد پھر دوسرے انحرافات پیدا ہوئے ۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلام کے نظریہ توحید کی امتیازی شان یہ ہے کہ یہ انسانی زندگی کے اندر نہایت گہرائی تک اترتا ہے ۔اسلام چاہتا ہے کہ انسانوں کی پوری زندی اس عقیدے پر استوار ہو' اور انسانوں کی زندگی کا عملی نظام پورے کا پورا عقیدۂ توحید کی اساس پر قائم ہو۔جس طرح اس کے اثرات تصورات و عقائد میں ہوں اسی طرح شریعت و قانون میں بھی ہوں ۔اور اس طرح کے آثار میں سے بڑا اثر اور اس کے نتائج میں سے بڑا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی پر شریعت الٰہیہ کی حکمرانی ہو۔اگر اقرار توحید کے بعد یہ آثار نمودار نہ ہوں تو یہ سمجھا جائے گا کہ عقیدۂ توحید موجود نہیں ہے ۔

اس لیے کہ اسلام کا عقیدۂ توحید جب دل میں اترتا ہے تو وہ ارکان حیات اور نظام حیات اور اعمال کی شکل میں اگتا ہے ۔

اس کا مفہوم کہ اللہ ''احد'' ہے' یہ ہے کہ وہ ''صمد'' ہے' یعنی وہ کسی کا محتاج نہیں ۔ اور سب اس کے محتاج ہیں ۔ اور یہ کہ نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے ۔ اور اس جیسا کوئی نہیں ہے ۔ لیکن ''احد'' کے بعد ان دوسرے مفاہیم کو محض وضاحت کے لیے الگ ذکر کیا گیا ہے ۔

اَللّٰهُ الصَّمَدُ (۲:۱۱۲) ''اللہ سب سے بے نیاز ہے''۔ صمد کا لغوی معنی ہیں وہ جس کی اجازت کے بغیر کوئی امر طے نہ ہوتا ہو اور اللہ تو وہ سردار ہے جس کے سوا کوئی سید اور سردار نہیں ہے ۔ وہ اپنی الوہیت میں یکتا ہے اور سب اس کے غلام ہیں ۔ اور وہی وحدہ قاضی الحاجات ہے ۔ وہی ہے جو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہے' اور ہر بات کا فیصلہ اس کے حکم سے ہوتا ہے اور اس فیصلے میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہوتا ۔ اور یہ مفہوم خود لفظ احد میں بھی مکمل طور پر موجود ہے ۔

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ (۳:۱۱۲) ''نہ اس کی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے''۔ اللہ کی ذات وہ حقیقت ہے جو ازلی اور ابدی ہے ۔ اور اس کی ذات ایک حال سے دوسرے حال میں بدل نہیں سکتی ۔ اس کی صفت یہ ہے کہ وہ کامل مطلق ہے اور تمام حالات میں ذات باری کامل ہوتی ہے ۔ ولادت کا عمل سب کو معلوم ہے کہ پھٹنے اور بڑھنے سے عبارت ہے ۔ عدم سے وجود میں آنا یا نقص سے کمال کی طرف بڑھنا دراصل ولادت کی علامات ہیں اور اللہ ان چیزوں سے پاک ہے ۔ پھر ولادت کے لیے زوجیت کی ضرورت ہے اور پھر زوجہ ہمیشہ زوج اور خاوند کی ہم جنس ہوتی ہے ۔ اور یہ بھی اللہ کے لیے محال ہے' اور خدا کے احد ہونے کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا ۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (۴:۱۱۲) ''اور کوئی اس کا ہمسر نہیں''۔ نہ اس کا کوئی مماثل ہے اور نہ برابر ہے ۔ نہ وجود کی حقیقت کے اعتبار سے' نہ فاعلیت کے اعتبار سے' اور نہ اللہ کی کسی ذاتی صفت میں ۔ اور یہ بات بھی لفظ ''احد'' میں موجود ہے ۔ وہ چونکہ احد ہے اس لیے اس کا کوئی کفو نہیں ہے ۔ یہ سب فقرے ''احد'' کی تاکید و تشریح ہیں ۔ یہ عقیدہ اس زرتشتی عقیدے کی تردید کرتا ہے کہ اللہ خیر کا الٰہ ہے اور شر کا الٰہ کوئی اور ہے ۔ یہ ثنائی عقائد کے پیروکاروں کا خود ساختہ عقیدہ ہے ۔ یہ عقیدہ ایران میں مروج ہے ۔ چنانچہ قدیم ایرانی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ایک خیر کا الٰہ ہے اور دوسرا شر کا الٰہ ہے ۔ ایک نور کا الٰہ ہے اور دوسرا ظلمت کا الٰہ ہے اور جزیرۃ العرب کے جنوب میں بعض لوگ یہ عقائد رکھتے تھے جہاں ایرانیوں کی حکومت تھی ۔

یہ سورت اسلام کے عقیدۂ توحید کو پوری طرح ثابت کرتی ہی ۔ جس طرح سورۃ الکافرون کا موضوع یہ تھا کہ عقیدۂ توحید اور شرک کے درمیان کوئی مصالحت اور مفاہمت نہیں ہو سکتی ۔ لہٰذا دونوں سورتوں کا موضوع مختلف زاویوں سے عقیدۂ توحید ہی ہے ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم روز مرہ کے معمولات کا آغاز صبح کی دو سنتوں سے کرتے تھے اور ان میں یہ دو سورتیں پڑھتے تھے ۔ اور صبح کی سنتوں میں ان کا پڑھنا با مقصد تھا اور یہ بات واضح بھی ہے ۔

--- ○○○ ---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۂ الفلق ـ ۱۱۳

۱-- تا -- ۵

سورۂ الفلق ایک نظر میں

یہ سورت اور اس کے بعد آنے والی سورت ابتداً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص ہدایات ہیں اور اس کے بعد ان کا اطلاق تمام اہل ایمان پر بھی ہوتا ہے 'کہ تمام خطرات سے بچنے کے لیے اللہ کے حظیرۂ امن میں آجاؤ' اللہ کی حفاظت اور پناہ میں آجاؤ۔ یہ خطرات ظاہری ہوں یا مخفی۔ معلوم ہوں یا مجہول۔ تمام خطرات سے اور خصوصاً فلاں فلاں خطرات سے۔ گویا اللہ تعالیٰ اپنے حظیرۂ امن اور اپنی پناہ گاہ کا دروازہ کھولتا ہے اور نہایت شفقت اور محبت سے ندا دیتا ہے کہ آؤ یہ محفوظ مقام ہے 'یہ جائے پناہ ہے تمہارے لیے 'تم یہاں مطمئن ہو جاؤ گے۔ آؤ' آؤ میں جانتا ہوں کہ تم ضعیف ہو' تمہارے بہت سے دشمن ہیں 'تمہارے لیے پر خطر مقامات ہیں۔ اور یہاں امن 'اطمینان ہے اور حفاظت و سلامتی ہے۔

اس لیے دونوں سورتوں کا آغاز یوں ہے :قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳: ۱) ''کہو' میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی''۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴: ۱) ''کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب کی''۔ اس کے نزول کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے بارے میں متعدد روایات ہیں۔ ان روایات سے وہ تبصرہ اور وہ فضا ثابت ہوتی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا۔ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نہایت فرحت و انبساط اور نہایت گہرائی اور کشادگی سے لیا۔

حضرت عقبہ ابن عامر سے روایت ہے 'فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :''کیا تم نے ان آیات پر غور کیا جو آج کی رات مجھ پر نازل ہوئیں؟ ایسی آیات اس سے قبل ہرگز نہیں دیکھی گئیں وہ یہ ہیں۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳: ۱) اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴: ۱) ہیں۔ (مالک' مسلم' ترمذی' ابو داؤد' نسائی) حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا ''اے جابر پڑھو''۔ میں نے کہا میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں میں کیا پڑھوں۔ آپؐ نے فرمایا :پڑھو'

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳: ۱) اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴: ۱) میں نے ان کو پڑھا۔ آپؐ نے فرمایا ''انہیں پڑھو ان جیسی سورتیں تم نہ پڑھو گے''۔ (نسائی) ذر ابن جیش سے روایت ہے 'کہتے ہیں :میں نے حضرت ابی ابن کعبؓ سے 'معوذتین کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا ''ابو المنذر تمہارے بھائی ابن مسعودؓ ان کے بارے میں یہ یہ کہتے ہیں۔ (حضرت ابن سعود ان کو اپنے مصحف میں نہ لکھتے تھے۔ لیکن بعد میں وہ صحابہ کرامؓ کی جماعت کی رائے کی طرف پلٹ گئے تھے اور ان کو اپنے مصحف میں لکھ لیا تھا)۔ تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا آپؐ نے فرمایا مجھ سے کہا گیا ''کہو''۔ تو میں نے کہا کہو۔ تو ہم اسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضور اکرمؐ نے کہا۔

غرض یہ تمام روایات اس پر مسرت اور پسندیدہ فضا کا اظہار کرتی ہیں جس کا ہم نے تذکرہ کیا۔

درس نمبر ۳۱۳ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۵

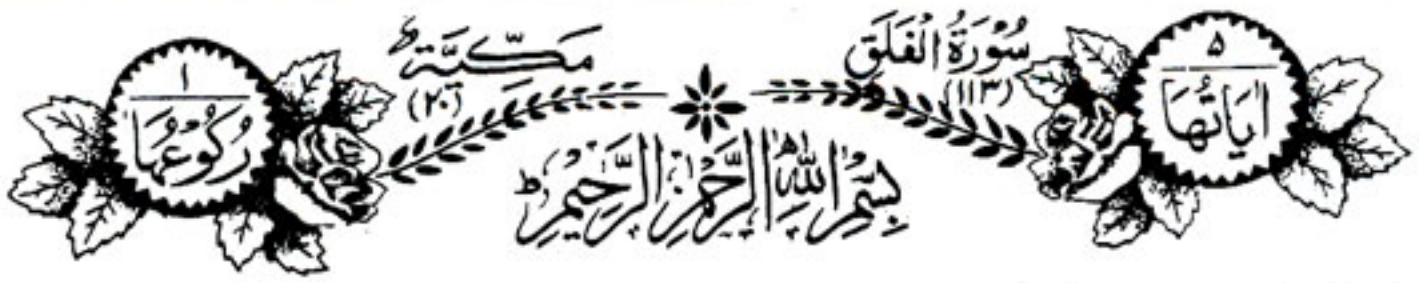

سُورَۃُ الفَلَق (۱۱۳) مَکِّیَّۃٌ (۲۰) آیَاتُهَا ۵ رُکُوعُهَا ۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ ۙ﴿۱﴾ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ﴿۲﴾ وَ مِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا ۱
وَقَبَ ۙ﴿۳﴾ وَ مِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ ۙ﴿۴﴾ وَ مِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾ ع ۵
۳۸

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

''کہو، میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی، ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے، اور رات کی تاریکی کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے، اور گرہوں میں پھونکنے والوں (یا والیوں) کے شر سے، اور حاسد کے شر سے جب کہ وہ حسد کرے''۔

اس سورت میں اللہ اپنی وہ صفات بیان فرماتا ہے، جس کے ذریعہ اس شر سے پناہ حاصل ہوتی ہے، جس کا ذکر اس سورت میں کیا گیا ہے۔

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ (۱۱۳ : ۱) ''کہو، میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی''۔ فلق کے معانی میں سے ایک معنی صبح کا ہے اور ایک معنی ''مخلوق'' کا بھی ہے۔ بایں معنی کہ ہر وہ چیز جس سے وجود اور زندگی پھوٹتی ہے جس طرح سورہ انعام (۹۵) میں کہا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الۡحَبِّ وَ النَّوٰی یُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَ مُخۡرِجُ الۡمَیِّتِ مِنَ الۡحَیِّ (۶ : ۹۵) ''اللہ دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے۔ وہ زندہ کو مردے سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ سے نکالنے والا ہے''۔ اور اگلی آیت (۹۶) میں ہے۔

فَالِقُ الۡاِصۡبَاحِ وَ جَعَلَ الَّیۡلَ سَکَنًا وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ حُسۡبَانًا (۶ : ۹۶) ''وہ صبح کو پھاڑ کر نکالنے والا ہے، اس نے رات کو وجہ سکون بنایا۔ اور سورج اور چاند کو حساب سے رکھا''۔

اگر فلق کے معنی صبح کا لیے جائیں تو معنی یہ ہوں گے ۔ صبح کے وہ رب جو روشنی پھیلا کر ہر چیز کو اس شر سے محفوظ کر دیتا ہے جو اندھیروں میں مستور ہوتی ہے اور اگر فلق سے مراد مخلوق ہو تو معنی یہ ہوں گے ۔ پناہ مانگتا ہوں مخلوق کے رب کی جو اپنی مخلوق کے شر سے پناہ دینے والا ہے ۔ لہٰذا دونوں صورتوں میں مفہوم بعد کے فقرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے ۔

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (۱۱۳ : ۲) "ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی یعنی مطلق اور اجمالاً تمام مخلوق کے شر سے ۔ اللہ کی مخلوقات میں سے بعض جب بعض سے ملتی ہیں تو اس اتصال سے بعض اوقات شر پیدا ہوتا ہے جبکہ بعض حالات میں مخلوقات کے ملاپ اور اتصال سے خیر اور نفع پیدا ہوتا ہے ۔ لہٰذا بتایا جاتا ہے کہ مخلوق کے شر سے پناہ مانگو تاکہ خیر ہی خیر رہ جائے ۔ اور اللہ کی ذات جو اس مخلوقات کی خالق ہے وہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ اس کو ایسی راہ کی ہدایت دے اور ایسی تدابیر کرے کہ ان سے خیر نمودار ہو اور شر کا ظہور نہ ہو ۔

وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (۱۱۳ : ۳) "اور رات کی تاریکی کے شر سے جب وہ چھا جائے" ۔ غاسق کے لغوی معنی کو دنے والے کے ہوتے ہیں اور وقب پہاڑ کے اس سوراخ کو کہتے ہیں جس سے پانی نکلتا ہے ۔ یہاں غاسق سے مراد رات ہے یعنی رات اور اس میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں یعنی وہ رات جب وہ پھوٹ کر زمین پر چھا جاتی ہے ۔ یہ رات بذات خود خوفناک ہوتی ہے اور اس وقت اس کی خوفناکی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب اس میں ہر خفیہ اور نامعلوم خطرہ درپیش ہو سکتا ہے مثلاً کوئی وحشی درندہ حملہ آور ہو جائے ' کوئی چور گھس جائے ۔ کوئی فریب دہندہ دشمن ہاتھ دکھا جائے ۔ کوئی زہریلا کیڑا مکوڑا اور سانپ کاٹ جائے ۔ پھر رات کے وقت خیالات و وساوس انسان پر حملہ آور ہوتے ہیں ۔ دکھ اور درد یاد آتے ہیں ۔ شعور و جذبات اور خواہشات و میلانات کی گھٹن زوروں پر ہوتی ہے ' اور تمام شیطانی قوتیں کھل جاتی ہیں اور ہر طرف سے برے اشارے ملتے ہیں ' اور انسانی شہوت رات کو زوروں پر ہوتی ہے ۔ غرض رات کے وقت ہر ظاہری اور خفیہ بلائیں حملہ آور ہوتی ہیں کیونکہ اس وقت اندھیرے چھائے ہوئے ہوتے ہیں ۔

وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ (۱۱۳ : ٤) "اور گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے" ۔ گرہوں میں پھونکنے والیاں کون ہیں؟ وہ جادوگرنیاں جو انسانی حواس پر سحر انگیزی کر کے اذیت دیتی ہیں جو اعصاب کو دھوکہ دیتی ہیں ' انسانی نفس کو اشارات دیتی ہیں اور انسانی شعور کو متاثر کرتی ہیں ۔ جو دھاگوں میں گرہیں ڈالا کرتی تھیں اور ان میں پھونکا کرتی ہیں جیسا کہ جادوگروں کی عادت ہوتی ہے ۔

جادو چیزوں کی حقیقت اور ماہیت نہیں بدل سکتا ۔ نہ کوئی نئی حقیقت پیدا کر سکتا ہے البتہ احساس و شعور پر ایسی تخیلاتی حالت طاری ہو جاتی ہے جس طرح کہ جادوگر چاہتا ہے ۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں سورہ طٰہٰ (۶۵ تا ۶۹) میں قرآن کریم اس کی تصویر کشی کی ہے ۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰی (٦٥) قَالَ بَلْ اَلْقُوْا فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِیُّهُمْ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی (٦٦) فَاَوْجَسَ

فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَۃً مُّوْسٰی (٦٧) قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی (٦٨) وَ اَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِکَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا اِنَّمَا صَنَعُوْا کَیْدُ سٰحِرٍ وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰی (٦٩)

(۲۰: ٦٥ تا ٦٩) "جادوگر بولے: موسیٰ تم پہلے پھینکتے ہو یا ہم پہلے پھینکیں؟ موسیٰ نے کہا: "نہیں تم ہی پھینکو"۔ یکایک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں' ان کے جادو کے زور سے موسیٰ کو دوڑتی محسوس ہونے لگیں اور موسیٰ اپنے دل میں ڈر گیا۔ ہم نے کہا مت ڈرو' تو ہی غالب رہے گا۔ پھینک جو تیرے ہاتھ میں ہے۔ ابھی ان کی ساری بناوٹی چیزوں کو نگل جاتا ہے۔ یہ جو کچھ بنا کر لائے ہیں یہ تو جادو کا فریب ہے۔ اور جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا خواہ کسی شان سے وہ آئے"۔

ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں سانپ نہ بن گئے تھے۔ البتہ حضرت موسیٰ اور عوام نے یہ خیال کیا کہ یہ رسیاں اور لاٹھیاں سانپ ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ اپنے نفس میں ڈر گئے اور اللہ کی طرف سے ان کو تسلی دینے کی ضرورت پیش آئی۔ لیکن حقائق اس وقت سامنے آئے جب عصائے موسیٰ فعلاً اژدھا بن گیا اور ان کی رسیوں اور لاٹھیوں کو نگل گیا۔

یہ ہے حقیقت سحر اور ہمیں چاہئے کہ ہم اسے اسی طرح تسلیم کریں۔ اس طرح یہ جادو لوگوں پر اثر ڈالتا ہے اور جادوگروں کے اشارے کے مطابق لوگوں کے حواس کو متاثر کرتا ہے۔ یہ انسانی نفسیات اور انسانی شعور میں خوف پیدا کرتا ہے اور لوگوں کو اذیت دیتا ہے۔ اور انسانی حواس اس طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جدھر جادوگر چاہتا ہے۔ جادوگری کی حقیقت بیان کرنے اور گرہوں میں پھونکنے کے مفہوم میں بس یہی کافی ہے۔ یہ ایک شر ہے جس سے بچنے کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی پناہ مانگو اور اللہ کی پناہ میں آ جاؤ۔

بعض روایات میں آتا ہے۔ ان میں سے بعض اگرچہ متواتر نہیں مگر صحیح ہیں کہ لبید بن اعصم یہودی نے مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا' بعض روایات میں آتا ہے کہ اس کا اثر چند دن تک رہا اور بعض میں آتا ہے کہ کئی مہینوں تک رہا۔ یہاں تک کہ آپؐ یہ خیال کرتے کہ آپؐ اپنی بیویوں کے پاس گئے ہیں حالانکہ آپؐ نہ گئے ہوئے تھے۔ اور بعض اوقات یوں محسوس کرتے کہ آپؐ نے کوئی کام کیا ہے' حالانکہ آپؐ نے نہ کیا ہوتا تھا' جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے اور پھر یہ سورتیں اس جادو کے بتانے کے لیے جھاڑ پھونک کے لیے نازل ہوئیں اور جب جادو کی وہ چیز حاضر کر لی گئی اور اس پر یہ سورتیں پڑھی گئیں تو وہ گرہیں کھل گئیں اور وہ برا اثر ختم ہو گیا۔ جس طرح بعض روایات میں آتا ہے۔

لیکن یہ روایات عصمت انبیاء کے بنیادی عقیدے کے خلاف ہیں کہ آپؐ اپنے تمام افعال اور تبلیغ میں معصوم عن الخطاء ہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ آپؐ کے اقوال و افعال سنت اور شریعت ہیں۔ یہ روایات اس سے بھی متصادم ہیں۔ پھر قرآن نے صراحت سے اس الزام کی تردید کی ہے کہ آپؐ پر جادو کیا گیا ہے کیونکہ مشرکین یہ الزام لگاتے تھے کہ آپؐ پر کسی نے جادو کر دیا ہے تب آپ یہ باتیں کرتے ہیں۔ اس لیے ہمارے نزدیک یہ روایات مستبعد ہیں۔ پھر خبر واحد کے ساتھ عقائد کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ عقائد کا ماخذ قرآن ہے اور احادیث سے عقائد تب ہی ثابت ہوتے ہیں جب وہ تواتر کی حد تک پہنچ جائیں اور جن روایات کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے وہ متواتر نہیں ہیں۔ مزید یہ کہ راجح قول یہ ہے کہ یہ سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں جس سے ان روایات کی بنیاد ہی کمزور ہو جاتی ہے۔

وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (۱۱۳ : ۵) "اور حاسد کے شر کے لیے جب وہ حسد کرے"۔ حسد کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کے اوپر اللہ کا کرم دیکھ کر کوئی برا تاثر لے اور یہ خواہش کرے کہ اس بندے پر سے اللہ کی نعمت زائل ہو جائے۔ چاہے اس تاثر کے بعد حاسد اس بندے سے نعمتوں کے دور کرنے کے لیے سعی بھی کرے۔ یا محض ذہنی تاثر کی حد تک رک جائے کیونکہ اس تاثر کے بعد ممکن ہے کہ وہ اس بندے کے خلاف کوئی شر عملاً بھی اٹھائے۔

اس کائنات کے بعض اسرار، نفس انسانی کے بعض راز اور جسم انسانی کے بعض رموز ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں ابھی تک ہمارا علم نامکمل ہے۔ اس لیے ہمیں بہت سختی سے ان کا انکار نہیں کرنا چاہئے۔ بعض پراسرار واقعات ان میدانوں میں واقع ہوتے ہیں اور ہم ان کی ماہیت تک نہیں پہنچ سکتے۔ مثلاً دور سے خیالات کی منتقلی کا عمل؛ جب دو افراد کے درمیان رابطہ ہو جاتا ہے' ایسے روابط کی خبریں اس قدر تواتر سے آ رہی ہیں کہ انسان ان میں شک نہیں کر سکتا' کیونکہ اس پر بہت تجربات ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں اور جو معلومات ہمیں دستیاب ہیں ان کی کوئی معقول توجیہ بھی ہمارے پاس نہیں ہے۔ مثلاً مقناطیسی عمل تنویم جو آج کل مکرر تجربے میں آ رہا ہے لیکن اس کے راز سے کوئی واقف نہیں ہے۔ دور سے خیالات کی منتقلی اور مقناطیسی عمل تنویم (ہپناٹزم) کے علاوہ جسم انسانی اور انسانی نفسیات کے بہت افعال جن کی تہہ تک ابھی تک انسان نہیں پہنچا۔

حاسد جدوجہد کرتا ہے اور اپنے اس تاثر کو اس شخص کی طرف بطور شر منتقل کرتا ہے تو ہم اس آثار کی اس منتقلی کا محض اس لیے انکار نہیں کر سکتے کہ ہمارے علم اور ہمارے آلات تجربہ کی رو سے اس انتقال کی کیفیت کو ابھی سمجھ نہیں سکے۔ اس لیے کہ نفس انسانی کے بارے میں ہماری معلومات ابھی تک ابتدائی ہیں اور یہ قلیل علم جو ہمیں حاصل ہوا ہے وہ محض اتفاقی طور پر ہمیں حاصل ہوا ہے۔ اس کو حقیقت کی شکل دینا ابھی تک باقی ہے۔

بہرحال حاسد کا شر ہوتا ہے اور اس سے اللہ کی پناہ مانگنا چاہیے اور اللہ کی حفاظت میں اپنے آپ کو داخل کرنا چاہئے۔ یہ اللہ کا فضل وکرم ہے کہ وہ اپنے رسولؐ کو ہدایت فرماتا ہے کہ وہ اللہ کی پناہ میں آئیں اور آپؐ کے واسطہ سے آپؐ کے بعد آنے والی پوری امت کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ بھی اللہ کی پناہ میں آئے۔ جو ہر قسم کے شر سے پناہ گاہ فراہم کرنے والا ہے۔

امام بخاری نے' اپنی سند کے ساتھ' حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ حضور اکرمؐ جب رات بستر پر لیٹتے تو دونوں ہتھیلیوں کو ملا لیتے' پھر ان میں۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱۱۲ : ۱) --- قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳ : ۱) --- قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴ : ۱) پڑھ کر پھونکتے۔ اور پھر پورے جسم پر ہتھیلیوں کو پھیرتے' جہاں تک ممکن ہوتا۔ سر اور چہرے سے شروع کرتے' اور جسم کے سامنے کے حصے پر جس قدر ممکن ہوتا اور یہ عمل آپؐ تین بار کرتے۔ (اس حدیث کو اصحاب سنن نے اس طرح روایت کیا ہے)۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۂ الناس ۔ ۱۱۴

۱-- تا-- ۶

درس نمبر ۱۴۳ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۶

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ ۱
الْخَنَّاسِ ۙ﴿۴﴾ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ﴿۶﴾ ع ٦ ع
۳۹

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"کہو' میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب' انسانوں کے بادشاہ' انسانوں کے حقیقی معبود کی' اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے' جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے"۔

اس سورت میں پناہ مانگنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ انسانوں کے پروردگار' انسانوں کے بادشاہ' اور انسانوں کے الٰہ کی پناہ گاہ میں پناہ لینے کے اعلان کا حکم ہے اور جس چیز سے پناہ مانگنے کا حکم ہے وہ بار بار وسوسہ ڈالنے والے شیطان کا شر ہے' جو لوگوں کے دلوں تک جا پہنچتا ہے اور وہاں وسوسہ اندازی کا کام کرتا ہے اور جو جنوں سے بھی ہے اور انسانوں سے بھی ہے۔

یہاں رب تعالیٰ کی جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے یعنی رب' بادشاہ' الٰہ اور معبود' یہ وہ صفات ہیں جو بالعموم شر کا دفعیہ کرتی ہیں اور دفعیہ اس شیطان کے شر سے کیا جاتا ہے جو دلوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اور بار بار چھپ کر آتا ہے۔

صفت رب کے معنی ہیں' مربی' نگہبان' حامی' ہدایت دینے والا۔ ملک کی صفت کے معنی ہیں حاکم متصرف' مقتدر۔ الٰہ کے معنی ہیں بلند و برتر' حاوی اور مقتدر اعلیٰ۔ یہ وہ صفات ہیں جن میں شر سے بچانے کا عنصر شامل ہے' وہ شر جو دلوں تک خفیہ انداز سے پہنچ جاتا ہے۔ اور انسان کے بس میں یہ بات نہیں ہوتی کہ وہ اس خفیہ طور پر در آنے والے شر کا دفاع کر سکے۔

اللہ تو سب چیزوں کی پرورش کرنے والا ہے۔ سب کا مالک ہے' سب کا حاکم ہے لیکن یہاں ان صفات کی نسبت الناس کی طرف کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان یہ احساس کریں کہ اللہ کا مقام پناہ اور مقام حفاظت ان کے بہت قریب ہے۔

اور یہ اللہ کا بہت بڑا کرم ہے کہ وہ اپنے حبیبؐ اور اس کی امت کو اس طرف متوجہ کرتا ہے اور اپنے حظیرہ میں پناہ لینے کی دعوت دیتا ہے۔ اور اس دعوت میں اپنی صفات کی یاد دہانی بھی کراتا ہے کہ شیطان کی بعض ایسی خفیہ کارروائیاں بھی ہیں جن کا دفاع تم رب' الٰہ اور بادشاہ عالمین کی مدد کے سوا نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ شیطان ایسے مقام سے حملہ

آور ہوتا ہے۔ جس کا تمہیں شعور ہی نہیں ہوتا اور وہ ایسی راہ سے آتا ہے جس راہ سے اس کے آنے کا خیال تک نہیں ہوتا۔ وسوسہ کے معنی نہایت خفیہ آزار کے ہیں۔ خنوس کے معنی ہیں واپس ہو کر چھپ جانے کے ہیں اور خناس وہ ہوتا ہے جو یہ عمل ازروئے فطرت بہت زیادہ کرتا ہے۔ اس آیت میں پہلی صفت کو عمومی انداز دیا گیا ہے۔

اَلْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ (۱۱۴:۴) "جو وسوسہ ڈالتا ہے اور جو بار بار پلٹ کر آتا ہے"۔ البتہ وسواس اور خناس کے کام کو متعین کر دیا گیا ہے۔ اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ (۱۱۴:۵) "جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے"۔ اور اس کے بعد اس کی حقیقت کو بھی کھول دیا گیا ہے۔ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (۱۱۴:۶) "وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے"۔ یہ ترتیب گفتگو انسان کو بے حد چوکنا کر دیتی ہے۔ انسان فوراً متنبہ اور متوجہ ہو جاتا ہے تاکہ وہ معلوم کرے کہ یہ خطرناک کام کرنے والا کون ہے۔ (کیونکہ آغاز کلام میں اسے عمومی انداز میں بیان کیا گیا ہے)۔ اور یہ اپنے اس خطرناک کام کو کس طرح انجام دیتا ہے۔ تاکہ وہ اس کی مسلسل نگرانی کرے اور اس کے دفاع میں جدوجہد کرے۔

جب نفس انسانی، اس بیداری اور تجسس پر برانگیختہ ہونے کے بعد معلوم کر لیتا ہے کہ یہ وسوسہ اندازی کرنے والا لوگوں کے دلوں میں گھس کر وسوسہ اندازی کرتا ہے اور یہ کام وہ نہایت خفیہ انداز میں اور غیر محسوس طریقے سے کرتا ہے اور پھر جب نفس یہ معلوم کر لیتا ہے کہ یہ جنات میں سے بھی ہے جو ایک خفیہ مخلوق ہے اور یہ انسانوں میں سے بھی ہے جو نہایت خفیہ انداز میں جنوں کی طرح وسوسہ اندازی کرتے ہیں، جس طرح شیطان کرتا ہے۔ تو نفس انسانی اس عمل کی مدافعت کے لیے تیار ہو جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کی کمین گاہ، اس کے مقام حملہ، اور اس کے انداز حملہ کو اچھی طرح جان چکا ہوتا ہے۔

جناتی مخلوق کس طرح حملہ آور ہوتی ہے اور وسوسہ اندازی کرتی ہے۔ اس کے طریقہ کار کو تو ہم اچھی طرح نہیں جانتے۔ البتہ نفس انسانی پر اس کے آثار اور عملی زندگی میں اس کے نتائج کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آدم و ابلیس کی کشمکش بہت قدیم ہے۔ اور انسانیت کے خلاف اس جنگ کا اعلان تو شیطان نے پہلے سے کر رکھا ہے اور یہ اس داعیہ شر کی وجہ سے ہے جو خود اس کی تخلیق میں موجود ہے یعنی تکبر، حسد اور انسان کے خلاف دشمنی کی وجہ سے۔ اس سلسلے میں اس نے اللہ سے یہ کام کرنے کی مہلت بھی قدیم سے مانگ رکھی ہے اور اسے دے دی گئی ہے اور یہ اجازت اللہ نے اس حکمت کی بنا پر دی ہے جسے صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن انسان کو بھی اللہ نے اس معرکہ میں، مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا ہے، اسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑا۔ اسے ایمان کی ڈھال فراہم کی گئی، اسے ذکر الٰہی کا اسلحہ دیا گیا ہے اور اللہ کی پناہ گاہوں میں داخل ہونے کے لیے مضبوط قلعے دیئے گئے ہیں۔ اگر انسان اپنی ڈھال، اپنا اسلحہ اور اپنے قلعوں کو نظر انداز کر دے تو یہ اس کی اپنی کوتاہی ہوگی اور وہ خود اس کے نتائج کا ذمہ دار ہوگا۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان انسان کے قلب پر چھا جاتا ہے۔ جب ابن آدم اللہ کو یاد کرتا ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب وہ غافل ہوتا ہے تو پھر وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ (بخاری)

رہے انسان تو ان کی وسوسہ اندازیوں کے بارے میں ہم بہت کچھ جانتے ہیں اور ان کی بعض کارروائیاں تو ایسی ہیں کہ جو شیطان کی وسوسہ اندازی سے بھی زیادہ سخت ہیں۔

انسان کے ایک برے ساتھی ہی کو لیجئے۔ یہ اپنے رفیق کے دل میں غفلت کے وقت شرارت کا ایک ذرہ اتار دیتا ہے،

اسے خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ کہاں سے حملہ آور ہوا' یہ بیچارہ اس حملے کا دفاع بھی نہیں کر سکتا کیوں کہ دوست تو محفوظ و مامون ہے۔

ہر بر سر اقتدار شخص کے ساتھ کچھ شیطان حاشیہ نشین لگ جاتے ہیں۔ اور اسے قہار و جبار بنا دیتے ہیں' پھر اس سے فساد فی الارض کراتے ہیں اور وہ نسلوں اور فصلوں کو برباد کرتا چلا جاتا ہے۔

کان پھرنے والے چغل خور لوگ جو نہایت چکنی چپڑی باتوں کرتے ہیں اور نہایت خوبصورت انداز گفتگو ہوتا ہے ان کا۔ یوں لگتا ہے کہ موصوف تو صریح حق گو آدمی ہیں اور اس کی باتوں میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اور وہ لوگ جو شہوات کا ساز و سامان فروخت کرتے ہیں' جو انسانی جبلت کی راہوں سے حملہ آور ہوتے ہیں اور اس قدر شدید اور پرکشش طریقے سے کام کرتے ہیں کہ صرف قلب کی بیداری ہی اس حملے کا دفاع کر سکتی ہے اور صرف اللہ کی معاونت اور مدد ہی بچا سکتی ہے۔

آج دسیوں خفیہ وسوسہ انداز' اپنے دام تزویر پھیلائے انسانیت کی راہ میں بیٹھے ہیں۔ یہ نہایت خفیہ طریقوں سے' نفس انسانی کی خفیہ ترین راہوں سے' جن کو وہ اچھی طرح جانتے ہیں' حملہ آور ہوتے ہیں' یہ لوگ جنی شیطان سے زیادہ خفیہ انداز میں کام کرتے ہیں۔ اور نہایت خفیہ اور غیر محسوس طریقے سے نفس انسانی کے اندر گھس کر وسوسہ ڈالتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ضعیف ہے اور وہ ان عیاروں کی ان چالوں کا دفعیہ نہیں کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ ان کو خبردار کرتا ہے' ان کو مسلح کرتا ہے' ان کو ڈھال اور قلعے فراہم کرتا ہے کہ وہ اس خوفناک جنگ میں مقابلہ کر سکیں۔

یہاں ایک بات قابل توجہ ہے اور اس وسوسہ ڈالنے کی ایک صفت نہایت بامعنی بتائی گئی ہے کہ وہ ''الخناس'' ہے۔ اس لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ خفیہ طور پر چھپ کر بیٹھتا ہے۔ اور جونہی کوئی موقعہ ملتا ہے۔ خفیہ انداز مین گھس کر وسوسہ اندازی کرتا ہے لیکن یہ لفظ دوسری طرف سے یہ تاثر بھی دیتا ہے کہ یہ نہایت بودے کردار کا مالک ہے۔ اگر دیکھیں کہ شخص چوکنا ہے' اور بیدار ہے' تو یہ چھپ جاتا ہے اور یہ انسانوں میں سے ہو یا جنوں میں سے۔ جب کوئی اس کے مقابلے میں آئے تو یہ جہاں سے آتا ہے ادھر بھاگ جاتا ہے اور چھپ جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اچھی مثال دی ہے اور کیا ہی خوب تصویر کشی ہے۔

فاذا ذکر اللہ خنس و اذا غفل وسوس ''جب آدمی اللہ کو یاد کرے تو یہ چھپ جاتا ہے اور جب غافل ہو کر وسوسہ اندازی کرتا ہے''۔ یہ نکتہ انسان کو ایک گونہ قوت فراہم کرتا ہے کہ وہ جرات سے اس خناس کا مقابلہ کر سکے۔ یہ خناس ہے' چھپ کر بھاگتا بھی ہے۔ اور جب کوئی مومن ہتھیار لے کر آتا ہے تو یہ مقابلہ نہیں کر سکتا۔

لیکن دوسری جانب حقیقت واقعہ یہ ہے کہ آدم و ابلیس کا معرکہ ایک طویل معرکہ ہے جو اس دنیا میں ختم نہ ہو گا۔ شیطان قیامت تک چھپ کر اور موقعہ تلاش کر کے حملہ آور ہوتا رہے گا۔ اس لیے اس کے مقابلے میں مسلسل بیداری ضروری ہے۔ صرف ایک دفعہ بیدار ہونا کافی نہیں۔ یہ جنگ جاری ہے اور قرآن نے اس کی مختلف مقامات پر نہایت ہی خوبصورت تصویر کشی کی ہے اور سورہ اسراء (۶۱ تا ۶۵) میں عجیب تر ہے۔

و اذ قلنا للملئکۃ اسجدوا لادم فسجدوا الا ابلیس قال ء اسجد لمن خلقت طینا (۶۱) قال ارء یتک ھذا الذی کرمت علی لئن اخرتن الی یوم القیمۃ لاحتنکن ذریتہ الا

قَلِيْلًا (٦٢) قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا (٦٣) وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِى الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (٦٤) اِنَّ عِبَادِىْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا (١٧: ٦٥) (١٧: ٦١ تا ٦٥) "اور یاد کرو جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو' تو سب نے سجدہ کیا' مگر ابلیس نے نہ کیا' اس نے کہا "کیا میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے"۔ پھر وہ بولا دیکھئے تو سہی کیا یہ اس قابل تھا کہ تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی؟ اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے دے تو میں اس کی پوری نسل کی بیخ کنی کر ڈالوں۔ پس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ سکیں گے"۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اچھا تو جا' ان میں سے جو بھی تیری پیروی کریں' تجھ سمیت ان سب کے لیے' جہنم ہی بھرپور جزاء ہے۔ تو جس جس کو اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے' پھسلا لے۔ ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا' مال اور اولاد میں ان کے ساتھ ساجھا لگا۔ اور ان کو وعدوں کے جال میں پھانس --- اور شیطان کے وعدے ایک دھوکے کے سوا کچھ نہیں --- یقیناً میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہو گا اور توکل کے لیے تیرا رب کافی ہے"۔

اس معرکے کی یہ تصویر کشی اور اس کے یہ محرکات' خواہ براہ راست شیطان کی طرف ہو یا اس کے کارندوں کی طرف سے ہو' انسان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس میں انسان کمزور اور مغلوب نہیں ہے۔ انسان کا رب' اس کا بادشاہ اور اس کا حاکم و معبود پوری مخلوق پر حاوی ہے۔ اس نے اگرچہ ابلیس کو اجازت دے دی ہے کہ وہ ابن آدم کے خلاف یہ جنگ جاری رکھے' لیکن یہ شیطان بھی اللہ کے کنٹرول میں ہے۔ اللہ نے اسے صرف ان لوگوں پر غلبہ کا اختیار دیا ہے جو اپنے رب' اپنے بادشاہ اور اپنے معبود سے غافل ہیں لیکن جن لوگوں کے دلوں میں اللہ کی یاد زندہ رہتی ہے وہ شیطان اور اس کی ریشہ دوانیوں سے بچے رہتے ہیں۔ خیر اور بھلائی کو دراصل اس قوت کا سہارا حاصل ہے جس کے سوا قوت کا اور کوئی سرچشمہ نہیں ہے۔ بھلائی کی پشت پر وہ حقیقت ہے جس کے سوا کوئی اور حقیقت نہیں ہے۔ بھلائی کی پشت پر رب' بادشاہ اور الٰہ العالمین کی قوت کا سہارا ہے اور شر کی پشت پر خفیہ طور پر وسوسے ڈالنے والا ڈرپوک شیطان ہے جو چھپ کر کام کرتا ہے۔ سامنا نہیں کر سکتا اور اللہ کے صحیح بندے جو اللہ کی پناہ میں ہوتے ہیں ان کے مقابلے میں وہ شکست کھاتا ہے۔

وہ حقیقت جس پر خیر قائم ہے اور وہ چیز جس کے سہارے شر قائم ہے یہ اس کی بہترین تصویر کشی ہے اور خیر و شر کا یہ بہترین تصور ہے۔ پھر انسان کی ہمت بندھانے اور شر کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ تصور خیر و شر کا بہترین تصور ہے۔ اور انسان کو قوت اعتماد اور اطمینان سے بھر دیتا ہے۔

خدا کا شکر ہے آغاز میں بھی اور آخر میں بھی اسی پر انسان کو اعتماد کرنا چاہئے اور وہی ہے جو توفیق دینے والا ہے۔ وہی ہے جس سے مدد طلب کرنا چاہئے اور وہی ہے جو مدد کرتا ہے۔

---O O O---

(مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۹۵ء' بوقت ۱۰:۲۰ رات سید معروف شاہ شیرازی)

(اختتام کمپوزنگ ۱۷ مئی ۱۹۹۷ء بوقت ..: ۴ صبح قارئین سے مترجم اور ناشر "فی ظلال القرآن" کے لئے خصوصی دعاؤں کے درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور توشۂ آخرت بنا دے آمین ثم آمین۔ سید عارف شاہ شیرازی)